جلد ۱۳۳ ماہ رجب المرجب مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۴ء عدد ۴

مضامین

معارف کے خریداروں سے ایک ضروری گذارش

رسالہ معارف ہر ماہ کی ۱۵، ۱۶ تاریخوں کو حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے، اگر کسی صاحب کو ماہ کے آخر تک رسالہ موصول نہ ہو تو دوسرے ماہ کے پہلے ہفتہ میں ضرور طلب کرلیں ورنہ بعد میں رسالہ بقیمت روانہ کیا جائے گا، بہتر ہو تا کہ رسالہ رجسٹرڈ منگوایا جائے، اس کے لئے ۲۰ روپے چندے کے ساتھ ۳۳ روپیہ رجسٹری فیس بھی روانہ فرمائیں، چندہ بھیجتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں،

"منیجر"

شذرات

نومبر ۱۹۸۳ء میں علامہ محمد اقبال کی دوسری بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کے لئے لاہور گیا تھا، وہاں سے کراچی چلا گیا، جہاں بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر قیام لمبا ہو گیا، فروری میں واپس ہوا تو مارچ میں پھر کراچی جانا پڑا، سکھر کی تنظیم فکر و نظر کی طرف سے سندھی ادبی میلہ میں شرکت کی بھی دعوت تھی جو ۱۱، ۱۲ مارچ ۱۹۸۴ء کو منعقد ہوا، ہندوستان سے اس خاکسار کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، جناب جمیل احمد اور شری اودیار بھی شریک ہوئے، موخر الذکر دونوں حضرات تامل ناڈو سے تھے، اس کا افتتاح پاکستان کے صدر جناب جنرل ضیاء الحق نے کراچی کے مشہور ہوٹل شیرٹن ہوٹل میں کیا، سندھ کے نمائندے بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے، پہلے تنظیم فکر و نظر کے جنرل سکریٹری جناب اسلم صحبو نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا، جس میں زیادہ تر سندھ کے مسائل کا ذکر تھا، اس کے بعد پاکستان کے مشہور ایڈوکیٹ جناب خالد اسحٰق نے اردو میں ایک دلپذیر تحریر پڑھی جس میں اس ادبی میلہ کی نوعیت بتائی گئی تھی، پھر سندھ کے مشہور دانشور جناب نبی بخش بلوچ نے انگریزی میں اپنا مقالہ پڑھا، مولانا سعید احمد اکبرآبادی جناب صدر ضیاء الحق کے استاد دہلی میں رہ چکے ہیں، اس لئے ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، وہ اسٹیج پر جناب صدر صاحب کے پاس بٹھائے گئے، انھوں نے سندھ پر بڑی دلنشین تقریر کی، جو بہت پسند کی گئی، پاکستان کے مشہور ماہر قانون اور سیاست داں جناب اے۔ کے۔ بروہی کی بھی تقریر ہوئی، آخر میں جناب ضیاء الحق نے بڑے خطیبانہ انداز سے مجمع کو مخاطب کیا، جو کچھ انھوں نے کہا، تالیوں کی گونج میں سنا گیا،

جناب ضیاء الحق نے بیرونی مہمانوں اور اس نشست کے مقالہ نگاروں اور مقررین کو اپنے ہاتھ سے اجرک کی چادر اور سندھی ٹوپی پہنائی اور ایک مخمل کے ڈبہ میں سندھ کے اسلامک سنٹر کا نقشہ بھی پیش کیا، اور یہ بھی اعلان کیا کہ بیرونی مہمان پاکستان کے جس علاقہ میں جانا چاہیں حکومت کے اخراجات پر جا سکتے ہیں،

مقالہ خوانی کے تین اجلاس ہوئے جن میں سندھی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں مقالات پڑھے گئے، بیرونی مہمانوں میں اس خاکسار کے علاوہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری دو اجلاس کے خصوصی مہمان بنائے گئے، سندھی زبان میں عربی فارسی اور اردو کے الفاظ اتنے ہیں کہ سندھی زبان میں جو مقالات پڑھے گئے ان کو سنتے وقت سمجھ میں آ رہا کہ کیا چیز پیش کی جا رہی ہے، سندھ کے مشہور بزرگوں میں حضرات شہباز قلندر، حضرت سچل سرمست اور حضرت عبداللطیف بھٹائی کا ذکر بکثرت آتا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ سندھ کے بعض ماخذ اور منابع پر تھا، اس اجتماع میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب رجال السند والہند کا ذکر بار بار آیا، خود انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ گذشتہ بیس سال سے وہ سندھ پر کس طرح کام کرتے رہے ہیں،

میرے مقالہ کا عنوان "اہل سندھ کے لئے لمحات فکریہ" تھا، یہ جناب اے۔ کے۔ بروہی کی صدارت میں پڑھا گیا، اس میں بڑی صاف گوئی سے یہ عرض کیا گیا کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی بڑی بڑی حکومتیں بنیں، مگر وہ سب ختم ہو گئیں، پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی بڑی قربانیوں سے وجود میں آیا ہے، اب آئندہ کا مورخ ہی فیصلہ کرے گا کہ یہ قربانیاں بامقصد رہیں یا رائگاں گئیں،

اس کی بھی توجہ دلائی کہ اس برصغیر میں اسلام نے سب سے پہلے سندھ کو اپنی آغوش میں لیا، اس کو اس برصغیر کا باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے، یہاں بہت سے علماء، فضلاء، مفسرین اور محدثین گذرے ہیں، اس بنا پر ایک زمانہ میں یہ عرب صغیر کہلاتا تھا، یہاں کی مکلی پہاڑی میں ایک لاکھ پچیس ہزار اولیائے کرام مدفون ہیں، اس طرح یہ حدیقۃ الاولیاء بھی رہا، یہاں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت صدر الدینؒ حضرت رکن الدین حضرت شہباز قلندرؒ، حضرت سچل سرمست اور حضرت عبداللطیف نے اپنی اپنی تعلیمات سے اس سرزمین کو سونا بنانے کی کوشش کی ہے،

پھر یہاں کے گذشتہ علماء کی کچھ تفصیل سنائی کہ یہیں موسیٰ بن یعقوب ثقفی، محمد بن ابی الشوارب اور قاضی

محمد ابو محمد منصوری وغیرہ نے اسلامی علوم و فنون کی شمع روشن کی، اور یہیں سے باہر جاکر ابو معشر سندھی اور ان کے صاحبزادے ابو عبد الملک محمد بن ابو معشر، امام اوزاعی اور خالد ابو محمد بن سالم اور ابو العطار سندھی نے اپنے علمی اور مذہبی کارناموں سے سندھ کا نام روشن کیا تھا، کلہوڑہ دور میں مخدوم محمد معین نے اپنی مختلف تصانیف سے یہاں تصوف کو اچھی طرح سمجھایا، مخدوم محمد ہاشم نے اپنی تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف سے دین کی تبلیغ سنت کا احیاء اور شریعت کی ترویج کرکے سندھ کی آواز عرب و عجم تک پہنچائی، کلہوڑہ کے فرمانروا نور محمد کو مخدوم عبد الرؤف اسلامی تعلیمات دیتے رہے، علامہ محمد حیات سندھی نے مدینہ منورہ جاکر وہاں کے لوگوں کو اپنے دینی علوم کے سرچشمہ سے سیراب کیا،

یہ بھی سننے کی زحمت دی کہ شاہ فقیر اللہ علوی کی وجہ سے شکارپور نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت فقیر اللہ علوی کی وجہ سے رشد و ہدایت کا مرکز بن گیا تھا، ان کی اتنی تصانیف ہیں کہ اگر وہ شائع کی جائیں تو اس زمانہ کے سندھ کے غیر معمولی تشخص کا اندازہ ہوگا، ٹھٹھہ کے مولوی محمد صادق علوم عقلی میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں، میر نجم الدین عزلت کی تصنیف طوطی نامہ کو مولانا ضیاء الدین بخشی کی طوطی نامہ پر فضیلت حاصل ہے، میاں نعمت اللہ چودہ علوم سے واقف تھے، ان کا مدرسہ دینی علوم کا سرچشمہ تھا، ٹھٹھہ اپنی بے شمار اسلامی درسگاہوں کی وجہ سے علوم و فنون کا مدینۃ الحکمۃ بنا ہوا تھا،

آخر میں عرض کیا کہ قانع ٹھٹھوی کی طومار سلاسل گزیدہ، شجرۂ طریقت، اہل سنت اور معیار سالکان طریقت سے سندھ میں عارفانہ بازتازہ ہوتی ہے، قانع ٹھٹھوی نے مقالات الشعراء میں سندھ کے بہت سے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے حمد، نعتیں اور صوفیانہ شاعری پیش کرکے اس سرزمین کو بابرکات بنایا ہے، کیا سندھ کے علماء، اولیاء اور اہل دل شعراء کی روحیں یہ پیام نہیں دے رہی ہیں کہ یہ سرزمین پھر باب الاسلام، حدیقۃ الاولیاء اور عرب صغیر بن سکتی ہے، ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو ہندوستان سے ربانی خوشبو آتی ہے، کیا یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ جب سندھ کے ساحل سے بحر عرب ٹکراتا ہے تو اب عرب سے ربانی خوشبو کر سندھ کو معطر کریگی،

جناب عبد اللہ بھٹو صاحب نے ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں سکھر اور حیدرآباد میں بھی جلسے کرائے جنھیں ان کی تقریریں ہوتی رہیں، اسد اللہ بھٹو صاحب نے اپنی تواضع اور خاطر داری سے سندھ کی میزبانی کی روایات کو ہر طرح برقرار رکھا،

مقالات

منٹگمری واٹ کی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ پر ایک نظر

از۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ڈبلو منٹگمری واٹ نے محمدؐ ایٹ مکہ، محمدؐ ایٹ مدینہ، محمدؐ دی اسٹیٹسمین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کرلی ہے، ان کے مضامین ایسے جرائد میں نکلتے ہیں جو مسلمانوں کی راسخ العقیدگی کے حامل ہیں، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی میں قرآن پاک کی [illegible] بین الاقوامی کانگریس [illegible] ہوئی تھی تو وہ بھی اس میں مدعو تھے، اور ان کی بعض رائے کے حوالے بھی تقریروں میں سننے میں آئے، ان کی تصانیف کی شہرت تو سنی تھی، لیکن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، انکی تصانیف خاص طور پر حاصل کیں، ان کا مطالعہ شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ ان ہی مستشرقین میں ہیں جو انتہائی زہریلی باتیں اپنے طاقتور اور ماہرانہ انداز میں کہہ کر اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتے ہیں،

میرے پیش نظر اس وقت ان کی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ کا وہ اڈیشن ہے جو ۱۹۵۲ء میں چھپا، اب اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، نئے اڈیشن سامنے نہ رہنے کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ پہلے اڈیشن اور بعد کے اڈیشن میں کیا کیا ترمیمات کی گئی ہیں، لیکن پہلے اڈیشن میں

سب سے پہلے اس کتاب کے ماخذوں پر نظر پڑھی، اس میں زیادہ تر ابرنیس، رچرڈ بل، بوہل، کائتانی، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام گولڈزیہر، جیفری، گنیس، نکلسن، لولڈکی، بیل اینڈ دہری، ٹوری اور ولہاوسن اور دسط وغیرہ کے نام ملے، بخاری کا ذکر ضرور ہے، لیکن اس سے مدد فرانسیسی ترجمہ سے لی گئی ہے، قرآن مجید کو رچرڈ بل کے ترجمہ سے سمجھا گیا ہے، ازرقی کی کتاب اخبار مکہ کا سہارا جرمن اسکالر وسٹن منلڈ سے لیا گیا ہے، ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول اللہؐ، ابن سعد کی طبقات، طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور واقدی کی کتاب المغازی کا ذکر ضرور کر دیا گیا ہے، مگر یورپی مصنفوں کی کتابوں کے حوالے اس کثرت سے ہیں، کہ عربی کی تصانیف دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے فضلاء نے تحقیق و تدقیق کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے، کہ اس میں حوالے معاصر ماخذوں اور نہیں تو زمانہ کے لحاظ سے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالے دے کر اس کو مستند اور دقیع بنایا جائے، ترجمہ کے حوالوں سے اس کا پایہ گر جاتا ہے پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالوں سے تحقیقی تحریر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے، لیکن زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی کے مصنفوں کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں، اور ان ہی کا سہارا لیا ہے، جن سے ان کی نیت کے کھوٹ کو مدد پہنچ سکتی ہے، اور پھر عربی کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجے سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کی وقعت بڑی حد تک گر جاتی ہے۔

ابن اسحاق، ابن ہشام، کتاب المغازی از واقدی اور طبقات ابن سعد و تاریخ طبری کے حوالے مصنف نے ضرور دیے ہیں، مگر اسی حد تک جتنے ان کے لیے مفید تھے، ان کتابوں کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس سے مصنف بظاہر بے خبر معلوم ہوتے ہیں، ابن اسحاق نے فن مغازی میں شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی سمجھے جاتے ہیں، مغازی میں زیادہ تر لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر ہوتا ہے، اس لیے یہ فن سیرت نگاری سے مختلف ہے، ابن اسحاق پر یہ اعتراض ہے کہ

انھوں نے بعض واقعات یہودیوں سے سن کر لکھے ہیں، اس لیے ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ ان کو ثقہ سمجھتا ہے، تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار دیتا ہے، محمد بن اسحاق ہی کی کتاب کو زیادہ منقح اور اضافہ کر کے ابن ہشام نے اپنی سیرت مرتب کی لیکن ان پر یہ اعتراض ہے، کہ انھوں نے اس کتاب کو زیادہ تر بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص سمجھے جاتے ہیں لیکن امام بخاری کے استاد ابن مدینی اور نسائی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں، ابو حاتم بھی کہتے ہیں، کہ وہ استناد کے قابل نہیں۔

واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ہیں، کیونکہ اس کی لغو بیانی مسلّمہ عام ہو چکی ہے، محدثین کہتے ہیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اس لئے وہ اس کو کذاب کہتے ہیں، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں

" دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں۔ .... امام شافعیؒ نے اگرچہ اس سے روایت کی ہے مگر یہ صاف تصریح ہے کہ امام موصوف اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے (مقالات سلیمان جلد ۲ صفحہ ۱۱۰)

پھر واقدی کس طرح معتبر ہو سکتا ہے، ؟

طبقات ابن سعد کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، جو روایتیں واقدی سے لی گئی ہیں، وہ اس لیے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی ہیں کہ یہ ابن سعد میں درج ہیں،

طبری کی تاریخ مستند ضرور ہے، لیکن وہ بہت سی روایتیں ایسے راویوں کے ذریعہ بیان کرتا ہے، جن میں بہت سے ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس لیے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے

اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے۔

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلیؒ نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو (سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۹)، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کیجاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لینے اور کد و کاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے، (ص ۱۰۱) مولانا شبلیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ہیں، جس کی وضاحت مختصر طریقہ پر اس طرح کیجاسکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہوجاتا ہے، قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کردی جاسکتی ہیں جو واقعات بخاری ومسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے، تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ ارباب فقہ وہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہئے، سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ہوں ان میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے، اور جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی، اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق

وجہ سے اس کی تسلی کرلینی چاہیے، کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا، کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انھوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا، کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے، ڈبلیو، منٹگمری واٹ سے بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے، مگر وہ کیوں اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کی زحمت گوارا کرتے۔

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ہلکا کردیتے ہیں،۔۔۔۔۔۔ کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جاسکتا ہے، خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے سارے حالات مل جاتے ہیں، تب ہی ان کے عقائد سمجھ میں آتے ہیں۔

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں، رسول اللہؐ پر کتنی کتابیں لکھی ہیں، فارسٹر، اورنگ اسپرنگر، میور، مارگولیتھ، ڈی لیسی جانسٹن، مینیریہ، اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اہل قلم ہیں، جنھوں نے آپؐ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہے، اور ہونی بھی چاہئے، لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق نیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے، منٹگمری واٹ بھی یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے قلم اٹھایا، اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں، ان کا خیال ہے، کہ محمدؐ کی ایک تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی، کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی

نقطۂ نظر سے کرنے کے خواہاں ہیں، اس لیے انھوں نے مورخ بن کر اس کتاب میں اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں ایسے سوالات کے بھی جوابات ملیں گے، جو پہلے نہیں اٹھائے گئے، مگر اس کا فیصلہ ان کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا ان کے پیشرو دیورپین مصنفین نہیں لکھ چکے ہیں، ارونگ، میور اور مار گولیتھ وغیرہ کے ابتدائی ابواب میں وہ سب کچھ ملے گا، جو مصنف نے اپنے ابتدائی باب میں لکھا ہے، انھوں نے اپنے پیشرو مصنّفوں کی تحریروں کو اپنے انداز میں مرتب کر دیا ہے، اسی کے ساتھ ان کے ناظرین کو یہ حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ چبائے ہوئے نوالے کو چبا رہے ہیں، یا کوئی نئی بات پیش کر رہے ہیں، یا اسی کتاب میں کس حد تک وہ مورخ ہیں، کس حد تک عیسائیت کے خالص مبلغ اور حامی ہیں، صحیح تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اپنی کتاب لکھنا چاہتے تھے، جس کے لیے وہ ایک نتیجہ پر پہلے پہنچ گیے تھے، اسی کے مطابق اپنی تحقیق اور محنت کا صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر لیا، ان کا کیا مقصد ہے وہ آیندہ سطروں میں ظاہر ہوگا،

کتاب کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، خلاقی، مذہبی اور ذہنی پس منظر کا احاطہ کیا گیا ہے، اقتصادی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا دعویٰ ہے کہ قرآن ریگستانی فضا میں نہیں بلکہ اعلیٰ تمول کی صورت میں نازل ہوا (ص ۳) لیکن اس دعویٰ کے باوجود وہ ایک چلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں، کہ عرب کے باشندے بھوک سے عاجز ہو کر فتوحات کے لئے چل پڑے (ص ۳) یہ لکھ کر ان کی فتوحات کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کی مگر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نہیں بتایا کہ اس پس منظر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مددیار کاوٹ پہنچی، اس کی وضاحت کے بغیر عہد جاہلیت کے مکہ کی سیاست کا ذکر چھیڑتے ہیں، جس کے تجزیہ میں ان کے دل کا گوشہ بڑا نرم ہو گیا ہے، مکہ کی سیاست کے عنوان سے جو کچھ

لکھا ہے، اس میں قریش کی دھڑ بندی حلف الفضول، مکہ میں مختلف افراد اور قبائل کے اثرات، اس کی خارجہ پالیسی، اس پر بازنطینی، ایرانی اور حبشہ کی حکومتوں کی للچائی نظر، اس پر ابرہہ کے حملہ وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ محمدؐ کی بعثت اس وقت ہوئی، جب مکہ میں بڑی دولت اور بین الاقوامی سیاست کی آمیزش ناگزیر طور پر تھی (ص ۱۱)

وہ ایام جاہلیت کے قریش کی عقلمندانہ اور رہبر آزما سیاست دانی اور حلم کے بھی معترف ہیں، لکھتے ہیں، کہ ان کی سیاسی عقلمندی میں حلم چمکتا نظر آتا ہے، (ص ۱۱) ان کی رائے ہے، کہ ان کی قبائلی کش مکش معمولی درجہ کی تھی، جو مشترکہ مفاد ہی کی خاطر تھی، (ص ۸) وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں، کہ مکہ میں جمہوریت تھی، اس کا موازنہ ایتھنس کی جمہوریت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ ایتھنس میں اخلاقی اصولوں اور ایمانداری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن مکہ کے لوگ اس کے لیے فکرمند رہتے کہ عملی مہارت سے ایک اچھا رہنما کیسے ابھر سکتا ہے، (ص ۱۰)

مکہ کی خارجہ پالسی پر بھی بحث ہے، جس کو پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ کوئی پچھڑا ہوا نہیں بلکہ ایک ترقی پذیر علاقہ تھا، وہ لکھتے ہیں، کہ بازنطینی اور ایرانی امپائر جیسی دو بڑی قوتوں کے ساتھ حبشہ جیسی چھوٹی قوت کو بھی مکہ سے برابر دلچسپی رہتی، یہ دلچسپی اس کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے رہی، بازنطینی حکومت سے مکہ کے تعلقات دوستانہ رہے، حبشہ بازنطینی حکومت کا دوست تھا، اس لیے ان دونوں قوتوں سے جب کوئی خطرہ نہ ہوتا، تو مکہ کا تجارتی کارواں دور دور تک جاتا، مگر جب حبشہ سے تعلقات اچھے نہیں رہے، تو ابرہہ نے مکہ پر حملہ کر دیا، اس کے وجوہ یہ بھی رہے، کہ ابرہہ کی نظر میں مکہ کی بڑھتی ہوئی نفع بخش تجارت کھٹکی، پھر اسکو جو تقدس حاصل تھا، اس کی اہمیت بھی اس کو پسند نہیں آئی، شاید اس کے حرم کی دولت پر بھی اس کی للچائی نظر پڑی، پھر اس تجزیہ سے بھی محظوظ کیا ہے، کہ مکہ اس زمانہ کی بڑی قوتوں کی

کشاکش میں غیر جانب داری ہی کو اپنے لیے ضروری سمجھتا، اور جب بازنطینی اور ایرانی طاقتیں
برسرپیکار ہوتیں، تو مکہ کی اس غیر جانب داری کی اہمیت بڑھ جاتی' یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ رقم
طراز ہیں کہ مفید معلومات کے نہ رہنے کی وجہ سے یہ تمام باتیں قیاسات ہی سے لکھی جا رہی ہیں،
جن میں اگر بہت سی تفصیلات صحیح نہیں بھی ہوں گی، تو اس کی عام مرقع آرائی (Sound)
ہی نظر آتی ہے، (ص ۱۶) ایسے طرز استدلال اور انداز تحقیق کا کیا جواب ہو سکتا ہے' مولانا شبلیؒ
نے آج سے بہت پہلے ایسے یورپین سیرت نگاروں کے متعلق لکھا کہ وہ نہایت دور دراز قیاسات اور
احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتے ہیں، جن میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر
کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتے ہیں اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے
ہیں، (سیرۃ النبی جلد اول ص ۵۰)

مصنف کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے، کہ اگر کوئی ناقد ان پر یہ اعتراض کرے، کہ انکی کتاب
میں عرب کے ایام جاہلیت کے تاریک اور داغدار پہلوؤں کا ذکر نہیں تو وہ ان کی نشاندہی
آسانی سے کر دیں گے، لیکن ان کے قلم کی چابکدستی اسی میں نظر آتی ہے، کہ یہ تاریک اور
داغدار پہلو اس دور کے روشن پہلوؤں کی تفصیلات میں دب کر رہ گئے ہیں، اب تک مسلمانوں
کے سامنے ایام جاہلیت کی بڑی بھیانک تصویر تھی، جس کو مصنف اپنے خاص مقصد کے تحت
رد کرنا چاہتے ہیں، وہ اس دور کی تجارتی سرگرمیوں اور دوسری خوبیوں کی مرقع آرائی
اس لیے کرتے ہیں، کہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہؐ کی بعثت کے بعد مسلمانوں سے ان کا تصادم
ان کی اپنی قدروں کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا، غزوات مذہبی لڑائیاں نہ تھیں بلکہ تجارتی
برتری کی خاطر لڑی گئیں، وہ مکہ کے لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان کرنے میں فراخ
دلی سے کام لیتے ہیں، مسلمان مورخین تو یہ بتاتے ہیں، کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے'

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، اس
زمانے میں گھروں میں جائے ضرور نہ تھے، چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے
جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں
میں چراغ نہیں جلتے تھے تاریخ اور ادب میں یہ تصریح موجود ہے، کہ عرب کھنکھجورا، گوہ
اور گرگٹ اور جانوروں کے چمڑے کھاتے تھے، بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی
تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی
جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہیں تھی، قمار بازی شراب خواری اور زناکاری کا رواج
عام تھا، لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا معصوم
بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا، (سیرت النبی جلد اول ص ۱۱۸-۱۲۸) مولانا شبلیؒ
نے مستند حوالوں سے لکھا ہے کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں بڑے بڑے ارباب
اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے
زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس بن شریق
جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن
حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال
شنیعہ میں گرفتار تھے، (سیرۃ النبی جلد اول، ۲۱، معارف مطبوعہ مصر ۵۵)

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اسی ظلمت، تیرگی اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک
آفتاب عالم تاب کی ضرورت تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پوری ہوئی'
لیکن ہمارے فاضل مصنف موجودہ دور کی سیاسی اقتصادی اور عمرانی اصطلاحات کا سہارا
لے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان مورخین جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ سراسر غلط ہے، عربوں میں

قبائلی یک جہتی کے ساتھ انفرادیت تھی، جب مختلف قبائل مل جاتے، تو ان کا اعلیٰ ترین یونٹ بن جاتا (ص ۱۷)، ان میں اتحاد، ایک مشترکہ زبان، شعری روایت اور مادی مفاد کی بنا پر تھا، ان کی بدوی اقتصادیت تجارتی اور سرمایہ دارانہ اقتصادیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ (ص ۱۸) وہ لڑائی میں بہادر، مصیبت میں صابر، انتقام لینے میں مشتعل مزاج، کمزوروں کے حامی، اور طاقت وروں کے خلاف سرکش ہوتے، (ص ۲۰) ان میں فیاضی، میزبانی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسی اہم خوبیاں تھیں، ان کو اپنی آن، اور عزت زیادہ محبوب تھی جس کے لیے وہ قانون اور کسی بات کے صحیح وغلط کی پروا نہیں کرتے تھے (ص ۲۱-۲۰) یہ عرب (Arisloera-cy) اور (Egalitarianism) کے مجموعہ تھے، ان میں مساوات تھی، لیکن جو بہتر سے بہتر ثابت ہوتا، وہی ان کا قائد بن جاتا، (ص ۲۲) اسی طرح عربوں کی اور خوبیاں، اعلیٰ اخلاق، ان کی انسانی رشتہ داری کی روایت اور انسانی خوبیوں کا اعلیٰ معیار اس لیے دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت کو عربوں کی ان خوبیوں سے بڑی مدد ملی، اور جب یہودیوں اور عیسائیوں کی وحدانیت کا تصور اس میں شامل کر دیا گیا، تو اس میں اور بڑائی پیدا ہو گئی (ص ۲۴) یہ زور بیان اس لیے صرف کیا گیا ہے، کہ اسلام کی عظمت وجلالت میں گویا ربانی پیامات والہامات کی تعلیمات کو کوئی دخل نہیں رہا، لیکن یہی عرب جب اسلام قبول کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے مصنف جیسے مستشرقین کے دلوں کا نرم گوشہ ختم ہو جاتا ہے، ان عربوں میں زیادہ تر برائیاں نظر آتی ہیں،

مصنف نے عرب کے قدیم مذاہب کا مطالعہ نولدیکی، ولہاؤسن، لیمنس اور بارٹن وغیرہ کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا ہے، گو وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی معلومات جستہ جستہ ہیں، اس لیے قیاسات سے زیادہ کام لینے کا امکان ہے۔ (ص ۲۳) وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی (ص ۲۳) اور محمدؐ کے زمانہ کے ایامِ جاہلیت میں مذہب کا

اثر زیادہ نہ تھا، (ص ۲۳) وہ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے، (ص ۲۳) مگر اپنی تحریر کا رخ بدل کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو یزدانی نہیں سمجھتے، بلکہ یزداں کا مسکن تصور کرتے، ان کی پرستش غالباً بیرونی اثرات کی وجہ سے تھی، وہ ان کی یزدانیت کے قائل نہ تھے، بدویوں (Nomsds) کو تو ان پر اعتقاد بھی نہ تھا، وہ ان کو محض کاشتکاروں کا دیوتا سمجھتے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ عرب مکہ کے اردگرد کے مقدس مقامات کی زیارت کو بھی جاتے، حرم یعنی مکہ کے مقدس حلقہ کا احترام بھی کرتے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ جنگ احد میں ابوسفیان اپنے ساتھ لات اور منات بھی ساتھ لے گیے تھے، مگر وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں، کہ اس کا تعلق مذہب کے بجائے توہم پرستی سے تھا، وہ لات ومنات کا سرسری طور پر ذکر کر گئے ہیں، لیکن اس زمانہ میں جو اور دوسرے بتوں کی پرستش ہو رہی تھی اس کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں، صحیح بخاری (باب مکہ) میں ہے کہ خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو بت تھے، ان میں سے اہم بتوں مثلاً لات، عزیٰ، منات، یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع اور ہبل کا ذکر تو قرآن پاک میں ہے، اس زمانہ کی بت پرستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے مصنف اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کا اصل مذہب قبائلی طرز کی انسان دوستی (humanaTani onism) تھا، یعنی افراد تو فنا ہوتے رہیں گے، لیکن ان کا قبیلہ باقی رہے گا، اور اس کو رہنا چاہیے اور اس کی بقا کے لیے اس میں شریفانہ اوصاف باقی رہنا چاہیے، جو شریف النسل خون ہی سے ممکن ہے۔ (ص ۲۵)

فاضل مولف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب خدا کے قائل رہے، طرز استدلال ہے کہ قرآن کی شروع کی آیتیں ان کو مخاطب کرتی ہیں، جو خدا پر یقین رکھتے تھے، یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اسی کے بعد یہ بھی کہتے ہیں، ان کا یہ یقین بہت کچھ مبہم اور

گنجلک ہے، (ص ۲۶) پھر معلوم نہیں کس حوالہ سے یہ لکھ گئے ہیں، کہ قرآن میں سقر، القارعہ اور الحطمہ وغیرہ جیسے الفاظ بظاہر اس زمانے میں سمجھے نہیں گئے، لفظ بظاہر بتا رہا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر خود ان کو یقین نہیں، پھر لکھتے ہیں کہ سورۂ قریش سے یہ گمان (suggestion) ہوتا ہے کہ مکہ کے روشن خیال لوگ خدا ہی کی پرستش کر رہے تھے، پھر یکایک یہ کہہ جاتے ہیں کہ خدا کے لیے عربی لفظ اللہ ال الہ کا مخفف ہے جس کے لیے یونانی لفظ (ho theos) کی طرح دیوتا (god) کے ہیں، لیکن عام طور سے اس سے خدا ہی کا مفہوم لیا جاتا ہے، یہ ممکن ہے، کہ محمدؐ سے پہلے مکہ کے غیر اہل کتاب (pagan) اللہ سے مراد کعبہ کے مخصوص دیوتا ہی کو لیتے۔ اسی طرح جس طرح طائف کا دیوتا ال لات کہلاتا۔ مصنف اپنے احتمالات کو جاری رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں، کہ اگر اللہ خدا کے لیے استعمال ہوا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا بیان ہے، تو پھر اس کے گنجلک ہونے کے مواقع عظیم ہو جاتے ہیں، اس لیے اغلب یہ ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ تو خدا کو تسلیم کرتے لیکن ان کا یہ خیال بھی رہا کہ خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کی بنیاد پر وہ اس کو رد کر دیں، ان سطروں سے ظاہر ہے، کہ مکہ کے عربوں میں توحید کا تخیل گنجلک سا تھا، لیکن ہمارے مصنف کا قلم جب آگے بڑھتا ہے، تو لکھ جاتے ہیں، کہ وحدانیت کا تخیل عیسائیوں اور یہودیوں کے اثرات کی وجہ سے رہا ہوگا، ان سے تال میل کس کس طرح رہا۔ اس کی کچھ تفصیل بتانے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں، کہ مکہ میں عیسائی تھے، ان میں تاجر اور غلام بھی تھے، لیکن ان کے اثرات اہم نہ تھے (ص ۲۰) پھر وہ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات میں بہت سے عجیب و غریب خیالات بھی تھے، جن میں وہ غیر معمولی تخیلات بھی تھے، جو جعلی عیسوی عقائد (Pseudo god) سے حاصل کر کے عرب میں رائج کر دیے گئے تھے۔ قرآن میں تثلیث یعنی باپ بیٹے اور کنواری مریم کے

تصور پر تنقید، یقیناً ان عیسائی عربوں پر تنقید ہے، جو یہ خیال رکھتے تھے، پھر مصنف اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں، کہ جہاں تک یہودیوں کے اثرات کا تعلق ہے، یہ ان کو مقدس صحیفہ کے ذریعہ سے نہیں ہوئے، بلکہ مختلف قسم کے ثانوی ذریعہ سے پہنچے، مصنف کا یہ بھی احتمال ہے کہ وحدانیت کے سلسلہ میں یہودیت اور عیسائیت کے اثرات کے علاوہ اور ذرائع سے بھی یہ اثر ہوا گو یہ بہت قلیل رہا ہوگا، وہاں ایسے چھوٹے فرقے بھی رہے ہوں گے، جن پر وحدانیت کے معاملہ میں یونانی فلسفہ کا اثر رہا ہوگا، ایسے فرقے صابیین کے تھے، اس زمانے میں لفظ حنیف کا کچھ استعمال ہوا، تو اس کی بھی ایسی ہی ممکن تعبیر ہے، لیکن ان تمام احتمالات کا اشہب دوڑانے کے بعد مصنف یکایک یہ لکھ جاتے ہیں۔

”میں سادہ طریقہ پر یہ کہوں گا کہ وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی، اور اگر کوئی ایسی تحریک تھی، تو اس کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے۔ مثلاً عثمان بن الحویرث نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ وہ بازنطینیوں کی مدد سے مکہ کا تنہا فرماں روا ہو جائے۔“ (ص ۲۰)

یہ لکھ کر مصنف یہ کہہ جاتے ہیں، کہ حنیفیوں کے اس روایتی بیان میں سچائی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے، عرب اور خصوصاً مکہ میں چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جو مذہبی ماحول تھا، اس میں بہت سے ایسے سنجیدہ لوگ رہے ہوں گے، جو ایک خلا محسوس کر رہے تھے اور اپنی گہری ضروریات کو پورا کر کے اپنے کو مطمئن کرنے کے خواہش مند تھے، اسی کے ساتھ اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے، کہ عربوں نے یہودی و عیسائی خیالات کو کچھ ترمیم کے ساتھ قبول کیا، اس ترمیم کی وضاحت یہ کی ہے کہ انھوں نے تقدیر یا دہر کے پرانے خیالات کو خدا سے وابستہ کر رکھا تھا۔ عربوں میں خدا کا خیال اس حد تک

جاگزیں تھا، کہ وہ اپنے توہمی مراسم کو بھی خدا کے احکام ہی سے منسوب کر دیتے تھے مصنف کا احتمال آگے بڑھتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں، کہ مکہ سے ابرہہ کی مراجعت کی پرانی تعبیر قرآن سے پہلے کی ہو سکتی ہے، اور یہ خیال کہ عاد اور ثمود کے پیغمبر ہودؑ اور صالحؑ تھے، غالباً قرآن سے پہلے کا تھا، اور یہودیت اور عیسائیت کے تخیل نبوت سے لیا گیا ہے، یہ احتمال ان کی اس تحریر سے بھی ظاہر ہے، کہ محمد سے پہلے مسیلمہ نے پیغمبری کا جو دعویٰ کیا اس سے ظاہر ہے کہ نبوت کا خیال وہاں جڑ پکڑ چکا تھا، (ص ۲۹) معلوم نہیں مصنف نے یہ کیسے لکھ دیا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا، یہ تو اسلام کی ہر معمولی تاریخ سے معلوم ہو سکے گا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن آپ کی زندگی میں اس کی آواز نہیں سنی گئی، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اس کی آواز ابھری تو اس کے خلاف فوج کشی کی گئی اور وہ وحشی بن حرب کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اس قسم کی غلط بیانی اور احتمال کی خامہ فرسائی کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ہیں کہ محمدؐ کی سیرت کے مطالعہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی تفصیلات متنازعہ فیہ ہیں، لیکن اس کا احساس رکھنا ضروری ہے کہ ایسی خبریں ہوا میں محمدؐ کے پاس قرآن آنے سے پہلے تھیں، اور یہ آپ کی ذات کی تیاری اور آپ کے مشن کے ماحول کا جز ہو گیا، (ص ۲۹) اپنے قلم کی جا بکدستی ظاہر کی ہے،

اس کے بعد مصنف نے اپنا ابتدائی باب ختم کر دیا ہے، لیکن اس میں ان کے یقینیات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بیجا معلولات کو زیادہ دخل ہے، وہ بظاہر، غالباً، اندازہ کیا جاتا ہے، ہوگا، رہا ہوگا، شاید اور خیال ہے۔ احتمال ہے، وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا زیادہ لیتے ہیں، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس کا سمجھنا آسان نہیں،

وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں، کہ رسول اللہؐ کی نبوت سے پہلے عرب کچھ نہ کچھ وحدانیت سے متاثر تھے، ان پر یہودیت اور عیسائیت کے تخیل وحدانیت کا بھی کچھ اثر پڑا، لیکن جب تو یہ کہتے ہیں محمدؐ کی سیرت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں۔

قرآن مجید میں وہی سب کچھ ہے جو توراۃ اور انجیل میں ہے، انجیل میں بھی سب کچھ تھا، جو توریت میں تھا، قرآن مجید میں ہے۔

"پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا، خود ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی، اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا، اس کی تصدیق کرنے والی تھی۔ خداترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی، ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں، پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں جو اس کے آگے موجود ہے، اس کی تصدیق کرنے والی اور اسکی محافظ و نگہبان ہے"۔ (المائدہ - ۱۵ رکوع)

پھر بہت صاف صاف قرآن مجید ہی میں ہے۔

"جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں، ان ہی کی تصدیق ہے۔ (سورہ الرعد رکوع ۱۲)

رسول اللہؐ کے زمانہ میں آج کل کے مستشرقین کی طرح یہ بھی اعتراض ہوا کہ قرآن مجید میں اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو

کہتے ہیں کہ اجی یہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں، جنھیں بہ بنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں، دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر پہ لے رہے ہیں۔ (النحل۔ رکوع ۳)

قرآن مجید میں یہ بھی ہے کہ۔

دوسری طرف خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اتری ہے، اس طرح کے نیکو کاروں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ (النحل۔ ۱۶، رکوع ۴)

جب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں وحدانیت کی کوئی باضابطہ تحریک ہونے کی کوئی اچھی شہادت نہیں، تو پھر قیاسات اور تاویلات کی گھنی جھاڑیوں میں قلم کا گھوڑا دوڑانا کہاں تک صحیح ہے۔

اصلی یہودیت اور اصلی عیسائیت میں توحید کا جو تصور تھا، وہ ضرور اسلام میں آیا۔ اصل توریت اور اصل انجیل میں توحید کی وہی تعلیمات تھیں، جو اللہ تعالےٰ نے اپنے خاتم النبین کے ذریعہ سے کلام پاک میں پیش کیں، اگر ان تینوں ربانی صحیفوں میں توحید سے متعلق ایک ہی بات نظر آئے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، خود اللہ تعالےٰ نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ ایک بات مان لو جو تمھارے یہاں بھی وہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو۔

قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی	کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات

کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ۔	کی طرف جو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں۔
(آل عمران = ۶۳)	

مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے:۔

البتہ کلام پاک میں توحید کی وہ تعلیم نہیں جو تحریف شدہ توریت اور انجیل میں ہے، مثلاً یہود کہتے ہیں، کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، مسیحیوں نے بھی دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، اصل انجیل میں ایسی کوئی تعلیم نہیں، اور نہ اس میں یہ کہا گیا کہ اللہ یسوع مسیح اور مریم تینوں ایک ہیں، انہیں مت کہو ایک کہو، اصل انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی، کہ میری ماں کو معبود مانو، یہود و نصاریٰ نے تو اللہ کو چھوڑ کر احبار و رہبان کو بھی اپنا رب بنا رکھا تھا، قرآن مجید نے ایسے تمام عقائد کی تردید کی۔

قرآن میں ہے:۔

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰہِ	یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے،
وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ	عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے،
ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ بِاَفْوَاھِھِمْ	یہ بے حقیقت باتیں ہیں، جو وہ اپنی
یُضَاھِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی
مِنْ قَبْلُ قٰتَلَھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی	دیکھا دیکھی، جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا
یُؤْفَکُوْنَ ۔ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ	ہوئے تھے، خدا کی مار ان پر، یہ کہاں
وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ	سے دھوکا کھا رہے تھے، انھوں نے
اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَا	اپنے علما اور درویشوں کو ۔ ۔ ۔

اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا
وَّاحِدًا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحَانَهٗ
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَا
هِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ
نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

(توبہ ۳۰ تا ۳۲)

اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔
اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی
حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا
کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا
تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت
نہیں پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں
سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، یہ لوگ
چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں
سے بجھا دیں، مگر اللہ اپنی روشنی کو
مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ
کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کی جس اصل تعلیم کو بھلا دیا تھا، اللہ تعالے نے اپنے خاتم النبیین کے ذریعہ سے اپنے آخری صحیفۂ آسمانی میں یاد دلا دیا، اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کا اثر ہے یا یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی سنائی یا ان سے حاصل کی ہوئی باتوں کو قرآن مجید میں جمع کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے تو ان کے یہاں جو بگڑی ہوئی تعلیم تھی، اسکو رد کر کے اس کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کے لغوی اور نحوی اشتقاق کی بحث تو پرانی ہے، جس کو چھیڑ کر اس مفہوم کو گنجلک کر دیا گیا ہے، چاہے اس پر جتنی بحث کیجائے، مسلمان عام طور سے یہی سمجھتے ہیں، کہ یہ عربی لفظ ہے اور عربی کے اِلٰہ سے مشتق ہے، اور یہ تسلیم کہ یہ کلدانی اور سریانی کے الاھیا یا عبرانی کے الوہ سے مشتق ہو اور یہ تسلیم کہ قرآن سے پہلے جاہلی شعراء کے یہاں یہ لفظ ملتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کلدانی، سریانی

عبرانی بولنے والوں اور جاہلی شاعروں کے یہاں اور قرآن اور اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے؟ اللہ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ ایام جاہلیت میں توحید تھی، تو پھر مصنف کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کہ اس زمانے میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی، (ص ۲۳) پتھروں اور درختوں کی پوجا ہوتی تھی، (ص ۲۳) خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کو خیال رہا کہ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کو وہ رد کر دیں، اسی طرح وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی، (ص ۲۸) وغیرہ وغیرہ۔ ایام جاہلیت میں اللہ کا ذکر ضرور ہے۔ اور کچھ تھوڑے سے لوگ توحید کے قائل رہے، لیکن اس زمانہ کے عام لوگوں کا یہ عقیدہ رہا۔ کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (الٰہ) ہے، اس کے کچھ شریک بھی ہیں، اس میں اور جنوں میں باہم کوئی رشتہ قائم ہے، اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں وغیرہ، اسی لیے ایم، اے میور کو بھی یہ لکھنا پڑا۔ کہ اس زمانے میں بت پرستی اور بنو اسمٰعیل کے بیہودہ اعتقادات کی لہر جوش مارتی ہوئی کعبہ سے آکر ٹکراتی تھی۔ (دیباچہ XCVII) قرآن مجید نے ایسے تمام باطل عقائد اور توہمات کی تردید کی، اور اللہ کے تصور میں اس کی وحدت، وحدانیت، مشیت، وسعتِ قدرت، رحمت، محبت کی ایسی اعلیٰ تعلیم پیش کی جو موجودہ توریت اور انجیل میں بگاڑ دی گئی تھی، جس کو قرآن مجید اور اسلام نے پھر سے استوار کر کے نکھار دیا، واضح رہے، کہ جس زمانے میں وحی الٰہی آئی اس نے خدا پرستی میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں سکھائی، پرانی ہی باتوں کی تعبیر انسان کے وجدانی عقائد و تصورات اور علم کے مطابق کر دی، اس حقیقت کو مستشرقین اپنے مخصوص طرز کے معروضی مطالعہ کے ذریعہ جس رنگ میں چاہیں پیش کریں، مگر حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ہی رہے گی خود قرآن مجید میں ہے:۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ — اے نبی تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے۔

قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ۔

سورۂ حٰم السجدہ۔ رکوع ۲)

اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو، بے شک تمہارا رب بڑا اور درگزر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔

اسلام کی یہ صریح تعلیم ہے کہ تمام سچے مذاہب درحقیقت ایک ہی ہیں، ایک ہی پیغام ہے جو آدمؑ سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا، میرے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون "رسول وحدت" میں اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید نے ہمارے سامنے "دو" لفظ پیش کئے ہیں، دین اور شریعت جس کو منسک اور منہاج بھی کہتے ہیں، دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں، جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہو۔ مثلاً خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کی صفات کاملہ، انبیاؑ کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اچھے اخلاق اور برے اعمال کی جزا و سزا، یہ وہ اصل دین ہے، جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، اس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاؑ آئے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں، نہ قوم و ملت کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہوا تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے، یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں، اور اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ہے، دوسری چیز یعنی شرعۃ منہاج اور منسک وہ جزئیات احکام ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے

بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادت الٰہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے عبادت کی ہیئتیں الگ الگ ہیں، اعمال فاسدہ کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں، اب قرآن کے نقطۂ نظر سے مذاہب کے اختلاف کا یہ مطلب ہے کہ اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے، البتہ متفقہ حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیلی کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہتے ہیں، دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں، اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں، اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں، انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت بھیجا گیا ہے جب پہلا صحیفہ کھو گیا ہے، یا ذہنی تحریکات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ پر توراۃ نازل ہوئی اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، جو عہد نامۂ قدیم میں موجود ہیں، پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور جب اس میں انسانی اختراعات کا دخل ہو گیا تو قرآن اترا۔

باب۔ ۲

اس باب میں مصنف نے پہلے یہ بحث چھیڑ دی ہے، کہ رسول اللہ صلعم کے آباؤ اجداد کو مکہ میں اہمیت حاصل تھی، کہ نہیں، ان کا جو طرز استدلال عام طور سے اس کتاب میں ہے، وہی اس باب میں بھی ہے، ظاہر ہے، کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں آپ کے اسلاف سے

متعلق کچھ نہ کچھ شکوک ضرور پیدا کر دینا چاہتے تھے، اسی لیے اپنے خاص سلسلۂ معلومات سے پھر کام لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق مولانا شبلیؒ رقم طراز ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ ابا عن جد معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور ان ہی کی اولاد قریشی ہے، نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی علیل خزاعی تھے، قصی نے علیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبی تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے علیل نے مرتے وقت وصیت کی، کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کیجائے۔ اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا۔ قصی نے ایک دار المشورہ قائم کیا، جس کا نام دار الندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے، تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے . . . . قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رفادہ جو خدام عرب کا سب سے بڑا منصب تھا، ان ہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی، جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا، کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلائے جاتے تھے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا، کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب ان ہی کو ملا، علامہ ابن عبدربہ نے

عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے، کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں۔ قصی کے بعد قریش کی ریاست ان کے منجھلے بیٹے عبد مناف نے حاصل کی اور ان ہی کا خاندان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاص خاندان بنا، انہی کے دوسرے بیٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے ذمہ حرم کے زائرین کیلئے سقایہ اور رفادہ کی خدمت سپرد ہوئی، انھوں نے یہ فرض نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو سیر چشمی سے کھانا کھلانے کے لیے سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، روم کے قیصر اور حبش کے بادشاہ سے عرب تاجروں کے لیے ٹیکس معاف کرایا۔ جس سے قریش کے قافلۂ تجارت کی عزت بڑھی، عرب کے مختلف قبائل میں دورہ کر کے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچایا جائیگا، ایک دفعہ قحط پڑا، تو ہاشم نے شوربہ میں روٹیاں چور کر کے لوگوں کو کھلائیں، اسی لیے وہ ہاشم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۶۶۔ ۱۶۵)

مگر ہمارے مصنف نے ان کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ حجاج کی دیکھ بھال کا معاملہ ایک ادنیٰ درجہ کی چیز تھی، تجارت سے بڑے منافع حاصل ہو رہے تھے، اس لیے یہ کام ہاشم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ (ص ۳۰)

وہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے چاہ زمزم کی کھدائی کر کے یہ تو ثابت کر دیا کہ ان میں کام کے ابتدا کرنے اور سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت ہے اور خانۂ کعبہ کی عزت برقرار رکھنے میں بھی حصہ دار تھے، لیکن اس اعتراف کے باوجود وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے، کہ مکہ میں نمایاں آدمی تھے مگر کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود ان کو یہ معلوم ہو سکا کہ حجاج کو پانی فراہم کرنے کا حق ان ہی کو تھا، پھر ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لکھتے ہیں، کہ ان کی لڑکیوں کی شادی

مکہ کے بعض بہترین اور طاقتور ترین خاندانوں میں ہوئی، یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ جب مکہ پر ابرہہ کا حملہ ہوا تو وہی صلح و صفائی کے لئے بھیجے گئے، اس کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ وہ مکہ کے لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے ملے پھر لکھتے ہیں کہ ان کے ملنے کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن جب ابرہہ کی مراجعت ہوئی، تو ان کی حکمت عملی کی خود بخود نفی ہو گئی، پھر اپنی عادت کے مطابق قیاس سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہم نہیں بتا سکتے، کہ ابرہہ سے ملنے کے بعد عبدالمطلب کا اثر بڑھا کہ نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ان کی وفات ہو گئی لیکن یہ بہت آسانی سے بتا سکتے کہ ابرہہ سے ان کے ملنے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کے قبیلہ کا حال برا ہو رہا تھا، اس قسم کا اندازہ لگانے میں مصنف بہت ماہر ہیں۔

مصنف نے عبدالمطلب کی اہمیت بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے پیش رو سوانح نگاروں میں میور نے ان کی عظمت اور سطوت کی پوری تصویر اپنی کتاب دی لائف آف محمدؐ میں پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ چاہ زمزم کی کھدائی عبدالمطلب کی زندگی میں بڑی کامرانی تھی اور دوسرے کنوئیں چھوڑ دیے گئے، اور سب اس کی طرف مائل ہوئے، عبدالمطلب اس سے تمام زائرین کو پانی مہیا کرتے، اور بہت جلد کعبہ کے حصہ دار ہو گئے، ان کی شہرت بڑھتی چلی گئی، ان کے خاندان کے طاقتور بیٹوں نے ان کے رتبہ کو اور بڑھایا، اور وہ مکہ کے سردار بن گئے، ان کی یہ سرداری ان کی وفات تک رہی، میور نے یہ بھی لکھا ہے، کہ امیہ کے قبیلہ کو عبدالمطلب کی خوشحالی اور شہرت سے رشک پیدا ہوا تو اس کے لڑکے حرب نے اپنی فوقیت دکھانے کی خاطر عبدالمطلب کو چیلنج دیا، لیکن ایک قریشی نے ثالث بن کر عبدالمطلب کی برتری کا فیصلہ دیا، جس کو حرب نے تسلیم نہیں کیا، اسی وقت سے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں رشک و حسد پیدا ہونا شروع ہو گیا، عبدالمطلب کے اقتدار اور

طاقت میں اس وقت بھی اضافہ ہوا، جب انھوں نے مکہ کے بنو خزاعہ سے باہمی اعتماد کا معاہدہ کیا، یہ معاہدہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا، اور جب ابرہہ نے مکہ پر کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے حملہ کیا، تو مکہ کے لوگوں نے عبدالمطلب ہی کو اور سرداروں کے ساتھ ابرہہ کے پاس بھیجا، ابرہہ نے اس حملہ میں عبدالمطلب کے دو سو اونٹ پکڑ کر ضبط کر لیے تھے، عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے، تو اس نے ان کی بڑی عزت کی، اس نے ان کے اونٹوں کو اس امید پر واپس کر دیا کہ وہ کعبہ کے منہدم کرنے میں مدد دیں۔

عبدالمطلب نے اس کی بات نہیں مانی، بات آگے نہیں بڑھی عبدالمطلب مکہ واپس آئے اپنے لوگوں کو تو پہاڑیوں کی طرف چلے جانے کو کہا، لیکن کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر دعا کی کہ اے اللہ اپنے گھر کو بچا لے اور صلیب کو اس پر فتح نہ عطا کر، اس کے بعد ابرہہ کی فوج میں وبا پھوٹ پڑی، وہ واپس ہوئی تو سمندر میں غرقاب ہو گئی، اور ابرہہ بھی صنعا پہنچتے ہی مر گیا۔ (دی لائف آف محمدؐ۔ دیباچہ CXVII)

میور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب اپنے زمانہ کے اہم ترین، معزز ترین اور متمول ترین سرداروں میں تھے، مگر منٹگمری واٹ کی تحریروں سے ان باتوں کی تردید ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے حریف ہونے کی روایت مشکوک ہے، کیونکہ یہ بات زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے، پھر وہ یہ کہتے ہیں، کہ عبدالمطلب ابرہہ سے مکہ کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں ملے، بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور ابرہہ سے جا کر ملنے کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی، اس قسم کے اندازے لگانا ایک مورخ کے شایانِ شان نہیں، بہر حال میور اور منٹگمری میں کون صحیح ہے، اس کا اندازہ لگانے کے

بجائے یہ تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے، کہ یہ یورپی اہل قلم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہیں لکھیں اور اپنے زور قلم سے لکھ کر ناظرین کو متاثر کریں، ڈی لیسی جانسٹن نے اپنا زور قلم یوں لکھ کر دکھایا ہے کہ زمزم کی کھدائی کے بعد عبد المطلب کا رتبہ اور اقتدار اپنے باپ سے زیادہ بڑھ گیا تھا، اور جو فضیلت قصی کو حاصل تھی، وہ ان کو حاصل ہوگئی، اور ان کی شہرت بڑی بلندی پر اس وقت پہنچی، جب ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا، لیکن وبا سے اپنی فوج سمیت موت کے گھاٹ اترا۔ (ص ۴۰-۳۹)

حلف الفضول کی تفصیل طبقات ابن سعد ج ا ص ۸۲ کے حوالے سے مولانا شبلیؒ نے یہ لکھی ہے، کہ لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھر برباد کر دیئے تھے قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس ہوئے تو زبیر بن عبد المطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندان ہاشم زہرہ اور تیم عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے، اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں حاضر ہوں (سیرۃ النبی ج ا ص ۱۸۳) اب اسی بات کو مصنف نے کیا سے کیا کر دیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے لکھتے ہیں:-

کچھ دنوں کے لیے بنو ہاشم کی قیادت زبیر بن عبد المطلب کے سپرد کر دی گئی، یہ فجار اور حلف الفضول کا زمانہ تھا، زبیر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔

حلف الفضول کمزور قبیلوں کے اتحاد کا معاہدہ تھا، اس میں نمایاں حصہ عبد اللہ بن جدعان نے لیا، کیونکہ اس کا اجتماع اس کے گھر میں ہوا تھا، وہ فجار کی جنگ کے موقع پر مکہ کے اہم آدمیوں میں تھا۔ (ص ۳۲)

اوپر کی سطروں میں تو یہ لکھ گئے ہیں کہ حلف الفضول کمزور قبیلوں کا باہمی معاہدہ تھا، لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں:-

فجار کی جنگ اس وقت ہوئی جب محمد پندرہ اور بیس کی عمر کے درمیان تھے، اور کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں اپنے چچاؤں کی طرف سے اس میں تھوڑا حصہ لیا، وہ حلف الفضول کے موقع پر شاید موجود تھے، کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی تعریف بھی کی، اس معاہدہ کا مقصد نسبتہً مضبوط تر اور متمول تر قبیلوں کی بدعنوانیوں کے خلاف انصاف کو برقرار رکھنا تھا، اور یہ مقصد قرآن کی تعلیمات کے بعض مقصد سے بہت قریب تھا (ص ۳۳)

مولانا شبلیؒ کے بیان سے تو ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ اس لیے ہوا کہ ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ لیکن مصنف نے اپنی طرف سے یہ اختراع کیا، کہ یہ معاہدہ مضبوط اور متمول قبیلوں کے خلاف کمزور قبیلوں کی طرف تھا، دونوں تعبیروں میں کافی فرق ہے۔

زبیر بن عبد المطلب کی نمایاں حیثیت کو مصنف نے اس لیے کم کرنے کی کوشش کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، وہ ابو طالب کی بھی اچھی تصویر نہیں کھینچتے، وہ لکھتے ہیں کہ ابو طالب اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ (ص ۳۲) لیکن مولانا شبلیؒ کی تحقیق ہے کہ عبد المطلب کی مسند ریاست پر حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبد المطلب

سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۷۶۔۔۔) ابو طالب برابر تجارت کرتے رہے، لیکن مصنف کا بیان ہے کہ ان کی غربت کی وجہ سے محمدؐ ان کے لڑکے علی کو اپنے ساتھ رکھنے لگے، یہ صورت حال اس لیے پیدا ہو گئی تھی، کہ ابو طالب میں نمایاں خوبیاں نہ تھیں، پھر عبد المطلب کی وفات سے پہلے اس قبیلہ کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا (ص ۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ شاید محمدؐ کی پیدائش سے پہلے وفات پا گیے تھے۔ (ص ۳۲) اور محمدؐ کی پیدائش شاید ان کے والد کی وفات کے بعد ہوئی، (ص ۳۳) مصنف نے اس تحریر میں "شاید" لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، کیونکہ اس میں کسی کو شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ہو گئی تھی، میور نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کی وفات محمدؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گئی تھی، (باب اول ص ۲) مارگولیتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ یقینی ہے کہ مستقبل کے پیغمبر کے والد کی وفات بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہو گئی (ص ۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ کی اہمیت کو مصنف نے اپنی معروضی تحقیق سے ایک بار پھر گھٹانے کی کوشش کی، پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے یہ اثر پڑتا ہے۔ کہ محمدؐ کا قبیلہ مکہ کی زندگی میں ایک زمانے میں آگے آگے تھا، لیکن محمد کے مشن کے آغاز سے پہلے یہ زوال پذیر تھا، یہ محض کمزور اور غریب قبیلوں کا ایک نمایاں رکن تھا، اس کے افراد شام کی تجارت سے دلچسپی لیتے رہے، لیکن شاید عبد شمس اور مخزوم قبیلوں کی طرح بڑی تجارت کے حصہ دار نہ تھے، (ص ۳۳) مصنف کا سخن تکیہ شاید اور غالباً ہے، اس کی آڑ لے کر وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں، شاید اور غالباً جیسے الفاظ سچی مورخانہ تحقیق پر دلالت نہیں کرتے۔

مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی تاریخ ۵۷۰ء لکھی ہے، اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، صرف یہ لکھ دیا ہے کہ عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے۔ میور نے یہی تاریخ لکھی ہے، مارگولیتھ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، ارونگ نے ۵۷۱ء کی تاریخ لکھی ہے (ص ۲۴) مولانا شبلیؒ نے ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء لکھی ہے، اس کی سند میں رقم طراز ہیں کہ مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ میں دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے (سیرۃ النبی ص ۱۷۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے جو واقعات قصے کے طور پر درج ہیں، ان کے متعلق مصنف کا طرز استدلال وہی ہے، جو عام طور سے ان کی اس کتاب میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شادی سے پہلے کے بہت سے قصے ہیں، جو دینی انداز کے ہیں، مگر ایک سیکولر مورخ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، یہ اس لیے بھی کہ ان واقعات کا ذکر محمدؐ کی آئندہ زندگی میں نہیں کیا جاتا، اور نہ ان کی کوئی سند ہے، اس کے بعد اپنی تحریر کا رخ بدل کر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان کو اہمیت دیتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ان کے لیے سچے ہیں، اور ان کے پیغمبر کی زندگی کے آغاز کا ایک مناسب دیباچہ ہے۔ اور پھر وہ اپنے شاید سے کام لیکر لکھتے ہیں، کہ شاید ان کے بیان کرنے کا طریقہ ایسا ہے کہ جیسے یہ آنکھوں دیکھا حال ہے، اور مثال میں ابن اسحٰق کی کتاب سے وہ سارے قصے چار صفحے میں نقل کر دیے گیے ہیں، جو آپ کے ایام رضاعت سے سفر شام تک بیان کیے گیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کی رضاعت کے لیے تیار ہو گئیں، تو ان کو اتنا دودھ ہونے لگا کہ آپ کے ساتھ آپ کا رضاعی بھائی بھی خوب سیر ہو کر

دودھ پینے لگا، اور وہ جب مکہ سے اپنے گھر واپس جانے لگیں، تو ان کی اونٹنی نے راستہ میں خوب دودھ دیا، اور اسی طرح برابر دیتی رہی، اور جس گدھی پر سوار ہوئیں وہ بہت تیز چلنے لگی، اور جس چراگاہ میں ان کی اونٹنی چرنے جاتی، وہ بہت شاداب رہنے لگی، پھر اس میں آپ کے شقِ صدر کی تفصیل بھی ہے، اور یہ بھی ہے کہ خود حضرت آمنہ نے بیان کیا کہ آپؐ جب پیٹ میں تھے، تو ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس نے بصرہ کے محل کو منور کر دیا، پھر اس میں حضرت ابو طالب کے ساتھ آپ کے سفرِ شام کا ذکر ہے جہاں عیسائی راہب سے ملاقات ہوئی، اس نے آپ کی نبوت کی بشارت دی اور بہت سی نصیحتیں کیں۔

ابن اسحاق کی یہ تمام روایتیں غیر مستند سمجھی گئی ہیں، حضرت حلیمہ سعدیہ کی رضاعت کے سلسلہ میں جو قصے بیان کیے گیے ہیں، ان کو غیر معتبر سمجھ کر مولانا شبلیؒ نے بالکل رد کر دیا ہے، اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کیا ہے، انھوں نے شق صدر کے واقعہ کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ سر سید احمد خاں نے اپنے خطباتِ احمدیہ میں اس کی پرزور تردید کی۔ اور لکھا کہ عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں، وہ اپنے یہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں اور توریت و انجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بمنزلہ وحی یعنی کلام الٰہی کے برابر سمجھتے ہیں۔ اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں، حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں، اسی طرح انھوں نے خیال کر لیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے، اور اس خیال خام سے انھوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں

کو ناقابلِ خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن و تشنیع کی ہے، حالانکہ وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں، کیونکہ مسلمان اپنے یہاں کی روایات و احادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کو یوں ہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے یہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں، جب ان کے لیے کافی ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں۔ ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے، یہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں، صحت سے بہت دور ہیں۔ بعض علمائے اسلام ان کو محض ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ اور بیہودہ افسانے خیال کرتے ہیں، جو محض جہلا کو خوش کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں، پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے کہ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ صفحہ ۶۵ - ۶۶۴)

سر سید نے یہ بات آج سے ۱۲۲ برس پہلے لکھی تھی، مگر یہ مستشرقین جن میں منٹگمری واٹ بھی شامل ہیں، دوسروں کی کب سنتے ہیں، وہ تو اپنی سی کہنا جانتے ہیں، اسی طرح بحیرا کی ملاقات کی روایت کو مولانا شبلیؒ نے بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

سر ولیم میور، ڈریپر اور مارگیولوس وغیرہ سب اسی واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے، اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے

تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں، کہ بحیرا کی ملاقات میں اس کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ اس ملاقات کی روایت ہی بالکل ناقابل اعتبار ہے، اس کے جس قدر طریقے ہیں۔ سب مرسل ہیں، راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۸۰)

منٹ گمری واٹ نے ابن اسحٰق کی ان روایتوں کو یکجا کر کے اپنی علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے، تو ان کی یہ تحقیق سعی نامشکور ہے، اور ان کو نقل کر کے ان کی تضحیک کرنا مقصود ہے، تو مسلمان محققین کب ان کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں، جو ان کی تضحیک سے وہ متاثر ہو جائیں گے۔ یا اگر وہ واقعی ان کو اس لیے مستند اور صحیح سمجھتے ہیں کہ یہ ابن اسحٰق کی روایتیں ہیں، تو پھر ابن اسحٰق کی اگر ہر روایت اور ہر رائے صحیح ہے تو ابن ہشام اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے بھی قائل اور دعوی دار ہیں، پھر منٹ گمری واٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے الہامی کلام ہونے کا قائل اسی طرح ہونا چاہیے۔ جس طرح ابن اسحٰق، ابن ہشام اور واقدی ہیں، یہ دیانت دارانہ تحقیق نہیں کہ انکی جو رائے مصنف کی مطلب برآری کے لیے ہو، تو وہ زوروں سے اچھالی جائے اور جو ان کے لیے قابل قبول نہ ہو اس سے انکار کیا جائے۔ (باقی آئندہ)

علمائے کشمیر کی فقہی خدمات

از
ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج، سرینگر کشمیر

کشمیر میں نمایاں طور پر دو فقہی مکتب رائج ہیں حنفی اور اثنا عشری، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے کشمیر پر ان کی اشاعت کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے متبعین کی علمی خدمات کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملے۔

کشمیر کے مسلمان مورخین کی صراحت کے مطابق جو پہلے صوفی مبلغ کشمیر وارد ہوئے، وہ حضرت شیخ شرف الدین عبدالرحمانؒ (عرف بلبل شاہ)، تھے، یہ مسلکاً حنفی تھے، انھوں نے حنفی مسلک ہی کے مطابق کشمیر کے نومسلموں میں عبادات ومعاملات کی تعلیم وتلقین کی، ان کے انتقال کے تقریباً نصف صدی بعد مبلغ شہیر حضرت میر سید علی بن شہاب الہمدانی (م ۷۸۶ھ) وارد کشمیر ہوئے۔ ان کے بارے میں علماء اور مورخین متفق ہیں کہ مسلکاً شافعی تھے۔ مگر جب انھیں اپنے پیش رو مبلغ سید شرف الدین عبدالرحمان کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے حنفی مسلک کے مطابق کشمیر میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کی ہے، تو انھوں نے بھی اسی کے مطابق اپنا مشن آگے بڑھایا، بڑی کامیابی کے ساتھ شافعی مسلک کے مطابق اسلام کی تبلیغ واشاعت کرسکتے تھے، مگر ان کی غرض وغایت فقہی اختلافات سے بلند وبالا ہو کر اسلام کی بے لوث خدمت تھی۔

اس لئے انھوں نے اختلافات سے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا دامن بچایا، اور اپنی چھوٹی بڑی

سینکڑوں کتابوں میں ایک جگہ بھی کسی فروعی مسئلے کو نہیں چھیڑا۔ اس حکمت و فراست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کی سرزمین سالہا سال تک مسلکی نزاعات اور تعصبوں سے محفوظ و مصئون رہی۔ خود لارنس (Walter Lawrance) نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔[1] تاہم اس کا یہ قول صحیح نہیں ہے، کہ کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ سے تعلق رکھنے والے مشائخ شافعی ہیں۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ کے مبلغ اور مجدد تھے، مگر وہ حنفی مسلک کے سخت مقلد تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں کوئی ایسا بزرگ گزرا ہو جس نے سنت کے کمال اتباع میں چند مسائل میں شافعی مسلک پر بھی عمل کیا ہوگا۔ جیسا کہ ملا عبدالرزاق گوجواری کے بارے میں منقول ہے۔[2] مگر اس کی مثال شیخ شرف الدین یحییٰ منیری یا شیخ نظام الدین اولیا جیسے بزرگوں کی ہے، جو مسلکاً حنفی تھے، مگر قرأت خلف الامام پر بھی عامل تھے۔[3] پروفیسر محب الحسن صاحب نے مولانا جعفر بدخشی (مرید و مجاز حضرت سید علی ہمدانی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ پہلے حنفی تھے پھر شافعی مسلک اختیار کیا تاہم اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو اپنا مسلک ترک نہیں کرنے دیتے تھے۔[4] اس تبدیلی مسلک کی وجہ شاید یہی ہوگی کہ حضرت سید علی ہمدانیؒ کو حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کی ذات سے والہانہ عقیدت تھی، اور وہ سلسلۂ کبرویہ کے ممتاز مبلغ بھی تھے، حضرت شیخ کبریٰ مسلکاً شافعی تھے۔[5] اس زمانے میں مرید اپنے مرشد کی پوری پوری متابعت میں ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں حضرت چلپی حسام الدینؒ نے بھی جو

[1] The valley of Kashmir P 265 [2] تاریخ حسن، مولوی غلام حسین ج ۲ ص ۲۲۹ [3] نزہۃ الخواطر۔ ج ۲ ص ۲۵۵ [4] Kashmir under The Sultans - P 57-58 [5] حضرت شیخ "خیوق" گاؤں کے رہنے والے تھے، اس گاؤں کے سارے باشندے شافعی تھے۔ معجم البلدان۔ یاقوت الحموی الرومی ج ۳ عنوان "خیوق" نیز دیکھیے برہان دہلی میں راقم کا مضمون "شیخ نجم الدین کبریٰ" بابت مئی و جون ۱۹۷۹ء

مذہباً شافعی تھے۔ اپنے مرشد نامدار حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ سے جو حنفی تھے اس مسلک پر عمل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، مگر مولانا نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔[1]

جب حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کشمیر تشریف لائے تو گو اس وقت یہاں اسلام داخل بھی ہو چکا تھا اور پھیل بھی چکا تھا، مگر شیخ شرف الدین کے نقوش دھندلے ہو گئے تھے، اور مسلمان صرف نام کے مسلمان ہو گئے تھے، جو تمام غیر شرعی رسوم و عادات پر عمل کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ سلطان قطب الدین جس نے حضرت امیر کبیرؒ کا ان کے ورود کشمیر پر پرتپاک اور والہانہ استقبال کیا تھا، مسلمان ہونے کے باوجود اس بنیادی مسئلے کی اہمیت و نزاکت سے بھی آگاہ نہ تھا کہ اسلام میں ایک ساتھ دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھنا قطعاً حرام ہے، اور وہ خود اس حرام کا مرتکب تھا۔

سلطان قطب الدین بسبب قلت رونق
احکام شرعی دو خواہر اعیانی را در
عقد نکاح خود گرفتہ بود

سلطان قطب الدین احکام شریعت
کی عدم اشاعت کی بنا پر دو سگی بہنیں
ایک ساتھ نکاح میں رکھے ہوئے تھا

چنانچہ میر سید علی ہمدانی نے سب سے پہلے یہی اہم اصلاحی کام انجام دیا کہ سلطان کو بھی اسلام کے ازدواجی احکام سے باخبر کیا۔ سلطان نے بھی خوشی خوشی ایک بیوی کو طلاق دے دی۔[2]

نوربخشی (شیعہ) فقہ کی اشاعت

ہندوستان میں شیعی علما اور مبلغین بہت پہلے وارد ہوئے ہیں، باطنیت کے مبلغین، جو شیعہ فرقہ ہی کی ایک شاخ تھی،[3] اپنے عروج اور ترقی کے ابتدائی دور ہی میں ہند وارد ہوئے تھے، یہاں تک کہ بعض محققین کے نزدیک کشمیر میں بھی میر سید علی ہمدانی وغیرہ

[1] صاحب مثنوی۔ قاضی تلمذ حسین صاحب۔ ص ۲۳۰ [2] بہارستان شاہی (قلمی)،
(۱) بہارستان شاہی (قلمی)، (۲) اسرار الابرار (قلمی)، (۳) دستگیری محمد [3] المذاہب الاسلامیہ مؤلفہ پروفیسر محمد ابوزہرہ مصری ملاحظہ کی جائے۔

مبلغین سے طویل عرصہ قبل یہ لوگ پہنچے تھے[1]۔ مگر ہندوستان میں شیعہ علماء کو اپنا مسلک پھیلانے کا اچھا موقعہ اُس وقت ملا جب بہمنی دور میں دکن میں خواجہ محمود گاواں منصب وزارت پر فائز ہوا، اس نے ان علماء کی ہمت افزائی کی[2] اس کے علاوہ بقول علی اصغر حکمت جب اکبر اور ہمایوں کے تعلقات شاہ طہماسپ کے ساتھ مضبوط ہوئے تو اس قربت اور ثقافتی و سفارتی تعلق نے بھی ہند میں شیعہ مذہب کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے میں مدد فراہم کی، اسی کے ساتھ سلاطین اودھ نے بھی اس کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا[3]۔

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے تو جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے یہاں صدہا سال تک صرف حنفی فقہ رائج رہی اور کشمیر کسی دوسرے فقہی مکتب سے مطلق نا آشنا رہا، بعض شیعی علماء کا دعویٰ بلا دلیل ہے کہ امیر کبیر سید علی ہمدانی بذاتِ خود شیعہ تھے اور آپ کے رفقاء بھی اسی مذہب کے علمبردار تھے۔ مُلّا نور اللہ شوستری نے یہ دعویٰ زیادہ پُرجوش طریقہ پر پیش کیا ہے، مگر اُن کے دلائل بھی وزن سے خالی ہیں[4]۔ وہ مولانا عبد الرحمٰن جامی پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے شیعہ مذہب اور شیعہ علماء سے عناد رکھنے کی بنا پر حضرت سید علی ہمدانی کا کا تذکرہ شرح و بسط سے نہیں لکھا ہے[5]۔ عصر حاضر کے شیعہ اہل قلم حضرات میں علی اصغر حکمت اور آغا بزرگ بھی ملا شوستری ہی کی تائید کرتے ہیں[6]۔ مگر پروفیسر محب الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ ملا شوستری کی خاص عادت یہ ہے کہ جہاں کہیں اسلام میں کسی نامور شخصیت پر ان کی نظر پڑتی تو وہ اُسے شیعہ قرار دیتے ہیں[7]۔

---

[1] دعوت اسلام (آرنلڈ) اردو ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی ص ۲۳۴-۲۳۵
[2] سرزمین ہند۔ علی اصغر حکمت ص ۷۶، [3] اس کے لیے راقم کی تصنیف "کشمیر میں اسلام کی اشاعت" کا ضمیمہ ۲ دیکھا جا سکتا ہے۔ ص ۲۲۳ تا ۲۲۷ [4] مجالس المومنین، مجلس ششم ص ۳۱ [5] الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ۔ ج ۱۰ ص ۲ [6] سرزمین ہند۔ ص ۷۶ -
[7] Kashmir Vnder The Sultans.

کشمیر کی تاریخیں اس پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے ۸۹۲ھ میں عراق کا ایک مبلغ میر شمس الدین کشمیر وارد ہوا، اُسی نے پہلے خفیہ طور پر شیعیت کی یہاں بنیاد ڈالی پھر چک امراء اور سلاطین کی معاونت سے کھل کر میدان میں آیا۔ میر شمس الدین عراقی نے اپنے مذہب و مشرب پر نوربخشیت کا غلاف چڑھایا، اس نے اپنے آپ کو سید محمد نوربخش کا خلیفہ اور ان ہی کو میر سید علی ہمدانی کا خلیفہ بتایا، مگر میر شمس الدین کے عقائد کے مطالعہ کے بعد یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد نوربخش حضرت سید علی ہمدانی کے خلیفہ رہے ہوں گے کیونکہ میر شمس الدین عراقی نے سید محمد نوربخش کی طرف جو عقائد منسوب کئے ہیں ان میں اور غالی شیعہ لوگوں کے عقائد میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اسماعیلی خوجوں کی تاریخ نور المبین میں بھی نوربخشیوں کو اسماعیلی بتایا گیا ہے[1]۔ ڈریو (Fredric K- Drew) نے بھی عام شیعوں اور نوربخشیوں کے کچھ اختلافات ذکر کیے ہیں[2]، تاہم بعض قدماء کی کا یہ بھی خیال تھا کہ سید محمد نوربخش کے عقائد سنیوں کے عقائد تھے، چنانچہ جب میر شمس الدین کی تصنیف اَحْوَط، جسے انھوں نے سید محمد نوربخش کے افادات اور فرمودات کا مجموعہ قرار دیا ہے، کا ایک نسخہ ہمایوں کے دربار میں پہنچا تو اس نے علماء سے اس کے بارے میں رائے طلب کی، علماء نے کہا کہ سید محمد نوربخش کے عقائد اہل سنت والجماعت کے عقائد تھے، جو اس کتاب کے مصنف سے کوئی میل نہیں کھاتے ہیں، کشمیر کے ایک قدیم مؤرخ سید علی یہ واقعہ اس طرح لکھتے ہیں:۔

چوں کتاب مذکور پیش ہمایوں بادشاہ رسید	جب یہ کتاب ہمایوں بادشاہ کے سامنے پہنچی
ہمایوں بادشاہ علماء و صلحاء جمع کردہ ایں	تو اس نے علماء و صلحا کو جمع کر کے کہا کہ اسے
کتاب را ملاحظہ کردند، دیدند کہ عقائد	ملاحظہ کریں، انھوں نے اسے ملاحظہ کرنے کے
اہل سنت و جماعت سید محمد نوربخش را بود	بعد کہا کہ سید محمد نوربخش اہل سنت و جماعت کے

---

[1] آب کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم طبع دوم۔ ص ۳۵۴ [2] Jammu And Kashmiir Territories P.359

و او سُنی بود۔ اما عقائد این صاحب کتاب تمام عقائد رافضی است[1]

عقائد پر کاربند اور سنی تھے مگر اس کتاب کے مصنف کے عقائد تمام تر شیعی ہیں۔

کچھ بھی ہو میر شمس الدین عراقی کشمیر میں شیعہ فقہ اور عقائد پھیلانے میں کامیاب ہوئے۔ اول اول انھیں علمائے اہل سنت کے ہاتھوں سخت مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر جب چند سرکردہ سیاسی لیڈروں کو شیعہ مذہب قبول کرانے میں انھیں کامیابی حاصل ہوگئی تو انھوں نے اپنے حریفوں کو آسانی سے مغلوب کیا۔ خاص طور پر جب کشمیر کا وزیر اعظم ملک موسیٰ رینہ ان کا عالی معتقد ہوا تو کوئی طاقت ان کے آگے ٹھہر نہ سکی۔ مورخ غلام حسن لکھتے ہیں۔

در متابعت و مطاوعت میر شمس الدین عراقی جان و دل کوشیدہ مذہب شیعہ را رواج داد اعیان اہل سنت را از جبر و قہر نمودہ بعضہا بقتل رسانید و بعضہا از ملک اخراج کنانید تا کہ عموم خلائق از قہر او ترسیدہ بمذہب شیعہ گرویدند[2]

وزیر موسیٰ رینہ نے میر شمس الدین عراقی کی کامل پیروی میں شیعہ مذہب کو رواج دینے میں دل و جان سے کوشش کی۔ اس کے لیے اہل سنت کے ممتاز لوگوں پر جبر و قہر کیا گیا بعضوں کو قتل اور بعض کو ملک بدر کیا گیا تاکہ عام لوگ جبراً و قہراً شیعہ مذہب قبول کریں۔

اس مذہبی جبر و اکراہ میں میر شمس الدین براہ راست شامل تھے، اور اس کی زد میں صرف سنی مسلمان ہی نہ تھے، بلکہ غیر مسلم بھی تھے[3]۔ بدقسمتی سے یہ مذہبی منافرت جس سے کشمیر کی سرزمین اس سے

---

[1] تاریخ سید علی (قلمی) ، شیعہ مخطوطات فارسی ریسرچ لائبریری کشمیر یونیورسٹی [2] تاریخ حسن ج ۲ ص ۲۲۳ [3] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی۔ ص ۲۱۸۔

قبل کبھی بھی آلودہ نہ ہوئی تھی، صدہا سال تک جاری رہی، اور بعض اوقات یہ خوفناک دہشت گردی اور بربریت کا باعث بھی بنتی تھی، تاہم جن مورخین نے میر شمس الدین کے ہاتھوں بجبر شیعہ ہونے والے لوگوں کی بڑی اور بھاری تعداد بیان کی ہے۔ ان کا بیان مبالغہ سے خالی نہیں ہے[1]۔ یہ مبالغہ آمیزی کرنے والے زیادہ تر میر صاحب ہی کے معتقد رہ چکے ہیں[2]، اور انھوں نے اپنے پیروں کے کارناموں کو شہرت دینے کے لیے ایسا کیا ہے۔

کشمیر میں شیعہ مذہب و مشرب کو پورے ستائیس برس تک (۱۵۶۱ء) تا (۱۵۸۸ء) سرکاری سرپرستی حاصل رہی جب چک خاندان برسر اقتدار تھا، اور مملکت کے اکثر اعیان نے "نوربخشیت" اختیار کر لی تھی۔ اس مختصر سی مدت میں اس مذہب و مشرب کو وادی کے مختلف مقامات پر جڑ پکڑنے کا اچھا موقع ملا اگر جبر و ظلم روا نہیں رکھا جاتا تو اس میں مزید استحکام پیدا ہونے کے امکانات بھی تھے، مگر بالآخر جب یعقوب شاہ چک نے سنیوں کے قاضی القضاۃ مفتی محمد موسیٰ سے اذان کے بعض کلمات بدلنے کے لیے فتویٰ مانگا اور انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ تو انھیں بڑی بے دردی سے قتل کروا دیا گیا۔ یہ حادثۂ فاجعہ نہ صرف نوربخشیت کے لیے سخت دھچکے کا باعث بلکہ خود یعقوب شاہ چک کی موروثی حکومت کے ذلت آمیز اختتام پر بھی منتج ہوا۔ اکبر کی یعقوب اور اس کے باپ یوسف چک سے لڑائی چھڑ گئی، اور اس نے انھیں گرفتار کر کے بقیہ زندگی بہار میں گزارنے کا حکم دیا، بہار میں ان کی قبریں آج بھی موجود ہیں۔ قاضی موسیٰ کی دلدوز شہادت پر ایک شیعہ مورخ اعتراف کرتا ہے۔

---

[1] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی، ص ۲۱۸ [2] جیسے صاحب بہارستان شاہی اور مصنف تحفۃ الاحباب (قلمی) ، [3] تاریخ بہارستان شاہی، میر شمس الدین عراقی کی مزید تفصیل کے لیے راقم سطور کی تصنیف کشمیر میں اسلام کی اشاعت دیکھی جا سکتی ہے۔

ازوقوع ایں تضیہ درمیان بزرگاں و اعیان و اہالی ممالک کشمیر واقعہ ہائل و حادث شد کہ بعابت آں حادثہ موجب نقصان بنیان قصر مملکت یعقوب شاہ گشت [1]

قاضی موسیٰ کا قتل تمام کشمیری باشندوں اور وہاں کے اکابر و اعیان کے لئے ایک ہولناک صورت میں ظہور پذیر ہوا اور بالآخر اس نے یعقوب شاہ کا قصر مملکت ہی ہلا کر رکھدیا۔

مسلک اہل حدیث | اصل مقصد گفتگو سے قبل کشمیر میں مسلک اہل حدیث کی اشاعت سے تعرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ ابتداً کشمیر میں صرف فقہ حنفی رائج تھی۔ پھر کافی مدت بعد یہاں نوربخشی فقہ کی اشاعت ہوئی یہ صورت انیسویں صدی کی ابتدا تک برقرار رہی۔

سُنّی مسلمان اصول و فروع میں حنفی مسلک کے مقلد تھے ہی اس کے ساتھ ہی ان کی رگ رگ میں صوفیاے کشمیر کی عقیدت و محبت بھی رچی ہوئی تھی، جو ان کی اسلامی زندگی کا ایک دوسرا نمایاں ترین پہلو رہا ہے، اس طرح محبت اولیا اور تقلید مذہب حنفی ایک ہی حقیقت کے دو نام بن گئے تھے، منقبت خوانی ختمات و اذکار کی معنویت، ذکر بالجہر، زیارت قبور، توسل و شفاعت، نذر و نیاز وغیرہ حنفیت کے اجزاے ترکیبی سمجھے جاتے تھے، جن کا انکار خود حنفی مسلک کے انکار کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

اپنے اس آبائی مسلک و مشرب کی حفاظت و احترام میں کشمیر کے مسلمان ابتدا ہی سے سخت حساس واقع ہوئے تھے، اور وہ ان میں ادنیٰ اصلاح کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے تھے۔

---

[1] تاریخ بہارستان شاہی۔ میر شمس الدین عراقی کی مزید تفصیل کے لیے راقم سطور کی تصنیف "کشمیر میں اسلام کی اشاعت" دیکھی جاسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ کشمیر میں اسلام کا وجود صرف صوفیائے کرام کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور اس حیثیت سے نہ ان کے فیوض و برکات کا انکار کیا جاسکتا اور نہ کشمیر کے مسلمانوں نے کبھی اس کا انکار گوارا کیا تاہم جب عقیدت عبادت کی صورت اختیار کرے تو یہ صوفیاے عظام کی امانت کی غیر شعوری خیانت ہی ہوگی۔ چنانچہ کشمیر کے مسلمانوں میں بھی صوفیہ کی عقیدت و محبت میں غلو پیدا ہونے لگا۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں علم و فکر کا بازار عرصہ دراز سے سرد پڑا تھا، اور یہ خطۂ زمیں دوسرے اسلامی مراکز سے کٹ کر رہ گیا تھا، جو تشنگانِ علم یہاں سے نکل کر دوسرے ممالک کو جاتے تھے وہ بہت کم اپنے وطن واپس آکر اس کی خدمت کرتے تھے، اس طرح یہاں علم کا بازار کافی حد تک بے رونق ہوگیا تھا۔ مزید براں سیاسی بدنظمی، اقتصادی بدحالی، غلامی سے پیدا ہونے والی عام افسردگی، اور جابر و ظالم امراء اور حکام کی لوٹ کھسوٹ جیسے عوامل بھی اس کے پیچھے کارفرما تھے، اس طرح صوفیاے کرام سے یہ عقیدت مندانہ غلو یقیناً کسی مُصلح کی اصلاح کا محتاج بن گیا تھا،

یہ خدا کا فضل تھا کہ جب اٹھارہویں صدی میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ، اور حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل دہلویؒ کی اصلاحی تحریک کو فروغ ہوا تو ان کے پیروکاروں میں کشمیر کے کچھ مسلمان بھی شامل ہوئے۔ اس کے ابتر سیاسی اور معاشرتی حالات ان دونوں بزرگوں کی نظر میں تھے، کشمیر ان کی تحریک سے عملاً اس وقت متاثر ہوا جب بالاکوٹ مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ان ایام میں بالاکوٹ اہل کشمیر کی سیرگاہ تھا۔

مگر یہ بدقسمتی تھی کہ ایک طرف ان دونوں بزرگوں کا سانحۂ شہادت جلد پیش آیا جس کی وجہ سے کشمیر کے مسلمان ان بزرگوں کے فیوض و فوائد اور اصلاح و تجدید سے محروم رہے اور دوسری طرف خود ان بزرگوں کے بعض مجتہدانہ افکار و آرا معرض بحث

بنے ہوئے تھے، اگرچہ ان کی طرف منسوب کی ہوئی بہت ساری باتیں بے بنیاد اور فرنگیوں کی منتقمانہ افواہوں پر مبنی تھیں تاہم ان کے بعض تفردات بھی کشمیر میں اصلاح کے بجائے منفی ردعمل کا باعث بنے۔

مشہور مورخ کشمیر مرحوم غلام حسن کھویہامی لکھتے ہیں:

دریں اثنا سید احمد خاں کہ از اعاظم ہندستان بود بہ بہانۂ حج چند سال در بلاد یمن و مسقط و نجد سیر و سیاحت می کرد و مطالعۂ کتاب التوحید مذہب وہابیہ قبول ساختہ بہ جانب ہند رجعت نمود در آں جا مولوی محمد اسماعیل دہلویؒ کہ از اقربائے مولوی عبد العزیز دہلوی بود اوّلاً مرید او شدہ بہ طفیل او جمع کثیر در حلقۂ متابعت او در آمدند مولوی اسماعیلؒ کتاب تقویۃ الایمان در تائید کتاب التوحید تصنیف کردہ شائع ساخت۔

اسی دوران میں سید احمد خاں (سید احمد شہید رائے بریلویؒ) جو ہندوستان کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے، حج کے بہانے سے بلاد یمن، مسقط اور نجد میں چند سال تک سیر و سیاحت کی اور کتاب التوحید کا مطالعہ کرکے وہابی مذہب قبول کیا اور ہندوستان لوٹے یہاں مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جو مولانا شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ کے رشتہ دار تھے، ان کے مرید ہوئے اور ان کی مدد سے اپنے پیرکاروں کی ایک بڑی جماعت تیار کی مولانا اسماعیلؒ نے کتاب التوحید کی تائید میں تقویۃ الایمان لکھکر شائع کی۔

(تاریخ حسن، ج ۱ ص ۴۴)

گو اس مورخ کے بعض خیالات بھی محل نظر ہیں تاہم ان سے ردعمل کا اندازہ ہوتا ہے، غرض ایک طرف تو یہ حضرات اپنی مصروفیتوں اور فوری شہادت کی بنا پر کشمیر کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کر سکے دوسری طرف بدعات کی تردید اور اصلاح رسوم میں ان کا اپنا خاص

اصلاحی پروگرام بھی تھا، جو کشمیر کے صدہا سال پرانے مذہبی مزاج کے ناموافق تھا۔ یہ اصلاحی پروگرام شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حرانیؒ اور شیخ محمد بن عبد الوہابؒ سے اگر ماخوذ نہیں تو متاثر ضرور رہا، جب کہ یہاں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ یا حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی اصلاحی سیاست کارگر ہو سکتی تھی۔ خود مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ جو طریقۂ تعلیم و تدریس اور اصلاح و تربیت میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے جانشین تھے،[1] بعض مسائل میں اپنے وطن کا رنگ لئے ہوئے ہیں، حضرت گنگوہیؒ شیخ محمد بن عبد الوہابؒ سے حسن ظن رکھتے تھے، اور ان کی خدمات کے معترف بھی تھے[2]، جب کہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ نہ ان کے علم و فکر سے متاثر تھے، اور نہ انکے اصلاحی خدمات سے۔[3]

شہدائے بالاکوٹ کے کافی عرصہ بعد جب نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مولانا سید میاں نذیر حسین صاحب محدث نے تصنیف و تدریس کے ذریعہ ہندوستان میں مسلک اہلحدیث کو تقویت پہنچائی تو اس سے کشمیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کشمیر کے بعض طلبہ ان علماء سے اکتساب فیض کرکے وطن واپس لوٹے تو عدم تقلید کی اشاعت شروع کی چنانچہ معاصر مورخ مرحوم غلام حسن لکھتے ہیں۔

خصوصاً فی زمانناسید صدیق حسن خان نواب بھوپال کہ از علماء برجستۂ روزگار است در اشاعتِ ایں ملت مجتہد وقت شدہ۔ در وثوقِ ایں ملت و توہین مذاہب

اس وقت خصوصی طور پر نواب صدیق حسن خاں، جو عصر حاضر کے زود نگار علماء میں ہیں اس مذہب کی اشاعت میں مجتہد ثابت ہوئے، موصوف نے غیر مقلدیت کی توثیق،

۱؎ موج کوثر۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ۲؎ فتاویٰ رشیدیہ حصہ اول صفحہ ۸۔ ۳؎ فیض الباری علی صحیح البخاری، ج ۱ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف اس موقف کے انتساب کی صحت میں شک کرنا ہمارے نزدیک درست نہیں ہے،

اربعہ و تردید مقلداں دفترہا نوشتہ است[۱]۔ | مذاہب اربعہ کی توہین اور مقلدین کی تردید میں کئی دفتر لکھ ڈالے ہیں۔

مورخ مرحوم آگے لکھتے ہیں:۔

"نواب صاحب نے اپنی تصانیف مواخات و مواسات کے بہانے سے کشمیر کے کچھ لوگوں کو بھیجیں جن میں حسین بطلکو نام کا ایک شخص بھی ہے، اس شخص نے دہلی جاکر میاں نذیر حسین سے استفادہ کیا، پھر وہاں سے عدم تقلید کا مبلغ بن کر کشمیر لوٹا مگر جب شہر (سرینگر) میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تو شوپیاں (اننت ناگ) گیا۔ اور اپنے مسلک کی تبلیغ میں مصروف ہوا۔ یہاں فوراً دو سو آدمی اس کے پیرو ہوئے[۲]۔"

نواب صاحب مرحوم کی مسلسل کوششوں اور میاں صاحب محدث کے تلامذہ کی سرگرمیوں سے شوپیان اور اسی کے ملحقہ دیہاتوں میں مسلک اہل حدیث سرعت سے پھیلا، مولانا عبدالرشید صاحب شوپیانی نواب صاحب کے دست راست اور خاص علمی معاون تھے[۳]۔ اسی طرح مشہور عالم اور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری کا آبائی تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا[۴]۔ تاہم یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جو حضرات یہاں مسلک اہل حدیث کی نمائندگی کرتے تھے، انھوں نے اپنی ساری توجہ چند فروعی مسائل پر مرکوز کی اور اس میں اتنی شدت برتی گئی کہ شیئاً للہ، آمین بالجہر، رفع یدین جیسے مسائل پر طرفین نے ایک دوسرے کے خلاف مقدمے دائر کئے اور ان مسائل کے کاغذات غیر مسلم ججوں کی میزوں پر گھومتے تھے، بعض اوقات یہ شدت

---

۱ تاریخ حسن ج۱، ص ۴۴ ۲ ایضاً ۳ نزہتہ الخواطر ج، ص ۲۶۱، وظفر اللاضی بما یجب فی القضاء علی القاضی، نواب صدیق حسن خان، بھوپال ۱۲۹۴ھ۔ ص ۱۷۱۔ ۴ تفسیر ثنائی (مقدمہ)

بڑے ہنگاموں کی صورت اختیار کرتی تھی، سر والٹر لارنس اپنے زمانے کے ایسے ہی واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سختی کے ساتھ تحریک وہابیت کچل دی جس سے یہ کچھ وقت کے لیے نیم جان ہو گئی، مگر پانچ سال بعد اب یہ پھر سر نکال رہی ہے چنانچہ اہل اعتقاد مسلمان اور سجادہ نشین عدم تقلید کی اشاعت پر پھر تشویش ظاہر کرنے لگے ہیں[۵]۔"

لارنس کے اس بیان کی تائید مورخ غلام حسن کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

فی الحقیقت اخگر این ملت در چمن خاطر اکثر با افتادہ است۔ اما بہ خوف حاکم نامدار شرر آں در زیر خاکستر نہان است عنقریب شعلہ آں بزیر فلک خواہد کشید[۶]۔ | سچی بات یہ ہے کہ غیر مقلدیت کا انگارہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں پڑ گیا ہے۔ مگر حکومت وقت کے خوف سے ابھی پوشیدہ ہی ہے عنقریب اس کا شعلہ آسمان میں اڑنے لگے گا۔

مورخ مرحوم کی یہ پیشنگوئی اس حد تک تو ضرور ثابت ہوئی کہ مسلک اہل حدیث مختلف جگہوں میں پھیل کر مقبول ہو گیا، مگر شعلے نہیں اڑے، مادہ پرستی اور آزاد خیالی بڑی تیزی کے ساتھ رسوم و روایات کو زیر و زبر کرتے ہوئے آگے بڑھی، یہاں تک کہ شوپیان میں ہی بہائیت، قادیانیت اور مارکسی اشتراکیت کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

اس تمہید کے بعد چند علمائے کشمیر کی اہم ترین فقہی تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی فقہی خدمات پر ہمارا جداگانہ مستقل مضمون ہوگا۔

ملا احمد علامہ اور ما الفتاوی الشہابیۃ | ملا احمد وہ صاحب علم بزرگ تھے، جو حضرت امیر سید علی ہمدانی

---

۵ The Valley of Kashmir P. 285 ۶ تاریخ حسن ج۱ ص ۴۴۲

سے کچھ پہلے اور حضرت سید شرف الدین (بلبل شاہ) کے کچھ بعد کشمیر وارد ہوئے تھے۔ اور اپنے علم و فضل سے بہت جلد سلطان شہاب الدین شاہمیری کے ممتاز درباری عالم بن گئے اور شیخ الاسلام کا خطاب پایا، یہ شاید کشمیر کے پہلے سرکاری شیخ الاسلام تھے۔ ان کے روحانی مرشد حضرت سید شرف الدین عبد الرحمٰن (بلبل شاہ) تھے۔ جن کے مقبرہ میں وہ دفن بھی ہوئے۔

ملا احمد کئی کتابوں کے مصنف تھے، ان میں الفتاویٰ الشہابیہ کشمیر میں بڑی مقبول ہوئی، یہ کتاب انھوں نے کشمیر کی اسلامی سلطنت میں سلاطین اور حکام کی رہنمائی کے لیے لکھی اور سلطان شہاب الدین کے نام پر معنون کی، پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب اس کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

و تم فی هذا الزمان تقریباً	تقریباً اسی زمانے میں کشمیر کے لیے
تدوین مجموعة الاولی للقانون	قانون کا ایک مجموعہ بھی مرتب ہوا
کشمیر و سمیت بالفتاوی	جس کا نام فتاویٰ شہابیہ رکھا گیا،
الشهابية وبفضلها کان	اسی کی بدولت کشمیر میں قانون
تنفیذ القانون الاسلامی	اسلامی کا نفاذ عمل میں آیا اور
فی کشمیر واصبح الاسلام سائداً	اسلام سیاسی اور معاشرتی زندگی
علی حیاتها العامة و	پر غالب آگیا۔
سیاستها۔[1]	

سید احمد سامانی، تنویر السراج | ملا احمد علامہ کی مذکورہ تالیف کے بعد کافی عرصہ تک فقہ اسلامی کی

[1] دیکھئے مقالہ۔ الارتقاء الثقافی بکشمیر فی عہد السلاطین۔ مجلہ ثقافۃ الہند دہلی بابت جون ۱۹۶۵ء

کشمیر میں کسی عالم کی کسی کتاب یا شرح کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس کی ضرورت بھی لاحق نہیں ہوئی ہوگی۔ علمائے اسلام بکثرت یہاں وارد ہوتے تھے اور ان کے ساتھ وسط ایشیا کے جلیل القدر علماء کی تصانیف بھی ہوتی تھیں، ان تصانیف کی موجودگی میں اُس وقت کشمیر میں غالباً کوئی نئی چیز پیش کرنے کی انھوں نے ضرورت نہیں محسوس کی یا ممکن ہے کہ انھوں نے کتابیں لکھی ہوں مگر اس وقت تک اس قسم کی کسی کتاب کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔

طویل عرصہ بعد نویں صدی ہجری میں حضرت شیخ احمد سامانی نے فرائض و میراث کے مشہور مختصر رسالہ "سراجی" کی شرح لکھی جو تنویر السراج کے نام سے آج بھی موجود ہے[1] ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ تحقیقات و نشریات میں اس کا ایک خوشخط نسخہ موجود ہے، شارح مرحوم حضرت سید محمد خاوری کے مزار کے متصل مدفون ہیں۔[2]

قاضی حیدر اور فتاویٰ عالمگیری | علمائے کشمیر نے مغل عہد میں فقہ کی اچھی خدمت انجام دی ہے، اور اس دور میں بعض علمائے کشمیر اپنی فقہی بصیرت میں بیرونِ کشمیر بھی مشہور ہوئے اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں قاضی، قاضی القضاۃ، میر عدل وغیرہ اہم مناصب پر فائز ہوئے، یہاں تک کہ بعض عورتیں بھی فقہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگیں، حافظہ خدیجہ بنت عبد الفتاح مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین کے ساتھ قدوری پر بھی وسیع نظر رکھتی تھیں۔[3] اسی عہد کے ایک نامور کشمیری عالم قاضی حیدر بھی تھے۔ جو علمائے ہند میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔

[1] تاریخ حسن ج ۳۔ [2] فہرست مخطوطات عربی و فارسی، ریسرچ لائبریری سرینگر۔ [3] کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ پروفیسر عبد القادر سروری۔ ص ۱۴۳۔

قاضی حیدر، قاضی خان کے لقب سے بھی مشہور رہیں، ان کی وفات ۱۱۲۱ھ میں ہوئی. تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاہجہان آباد دہلی آئے جہاں سعادت خاں صدر الصدور کی وساطت سے اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں رسائی حاصل کی، کچھ مدت بعد اپنے علم وفضل کے بدولت دہلی کے قاضی بھی مقرر ہوئے۔[۱] وزیر آباد کے امیر سے بھی گہرے تعلقات تھے، اورنگ زیب نے انھیں قاضی خان کا لقب دیا تھا۔[۲]

عالمگیری یا الفتاویٰ الہندیہ اورنگ زیب کا عظیم الشان علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جو سینکڑوں علماء پر مشتمل ایک اکیڈمی کی کوششوں سے وجود میں آیا ہے، اس کتاب کے اکثر مرتبین کے اسماء ابھی تک پردہ خفا ہی میں ہیں، موٴرخین لکھتے ہیں کہ ان علماء کی تعداد پانچسو تھی۔[۵] مولانا عبدالحی حسنی صاحب مرحوم نے جن بیس علماء کی نشاندہی کی ہے۔[۳] ان میں کشمیر کا کوئی عالم نہیں ہے، مگر مورخین کشمیر کی تصریح کے مطابق قاضی حیدر بھی اس اکیڈمی کے ایک رکن تھے، علاوہ ازیں تاریخی حیثیت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچی ہوئی ہے کہ کشمیر کے کئی اہل علم اور ادباء وحکماء کو عالمگیر اور اس کے پیشرو مغل سلاطین کے دربار میں بڑی عزت وقربت حاصل تھی، بعض علمائے کشمیر اور مغلوں میں تعلقات بھی تھے، اور وہ شہزادوں کے استاذ بھی رہ چکے تھے۔ اس لئے اگر فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں کشمیر کے فضلاء نے بھی اپنی خدمت پیش کی ہو تو مستبعد نہیں ہے، مستند مورخ کشمیر

۱۔ تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمان علی صاحب۔ ص ۵۲ ۔ ۲۔ The Contribution of India to Aralic Literature - By dr. Zubid Ahmed. Introduction - P27

۳۔ الثقافة الاسلامية في الهند۔ ص ۱۱۰ - ۱۱۱

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے عالمگیری میں قاضی حیدر کے اشتراک کا اگرچہ صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے، تاہم ان کے یہ الفاظ اسی حقیقت کے غماز ہیں۔

اکثر در مجالس تحقیق مسائل شرف حضورے داشت۔[۱]	عالمگیر کی تحقیقی مجلسوں میں حاضر رہنے کا شرف بھی حاصل تھا۔

موٴرخ غلام حسن کھویہامی کی تاریخ میں قاضی صاحب کی فتاویٰ عالمگیری میں شمولیت کا ذکر صراحت سے موجود ہے۔[۲]

قاضی حیدر کا انتقال دکن میں ہوا تھا، نعش کشمیر لائی گئی تھی وہ بچھ پورہ سرینگر میں مدفون ہیں۔

ملا عبیداللہ کشمیری، ترجمہ عالمگیری ملا عبیداللہ کشمیر کے نامور عالم تھے، اپنے علم وفضل سے فرخ سیر کے دربار میں مقرب ہوئے اور اسی کے ایماء پر فتاویٰ عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے، مگر شہزادے کی قسمت کا آفتاب بہت جلد غروب ہوگیا، جس کی وجہ سے ملا عبیداللہ اپنا کام چھوڑ کر اپنے وطن کشمیر لوٹ آئے، موٴرخین لکھتے ہیں کہ فہم وذکا اور ذہانت وفطانت میں وہ عجوبہ روزگار تھے ہندوستان اور ایران کے شیعہ علماء سے مناظرے کرتے تھے اور اپنے علم وفراست کا لوہا منواتے تھے، عمر بھر درس وتدریس سے وابستہ رہے اور سینکڑوں طلبہ کو مستفید کیا۔[۳]

حاشیہ توضیح وتلویح، حضرت شیخ یعقوب صرفی حضرت صرفی کشمیر کے جلیل القدر عالم دین اور روحانی پیشوا تھے، وہ بیک وقت مفسر ومحدث اور فقیہ بھی تھے، اور مقبول ادیب وشاعر بھی، ان کے تلامذہ میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جیسی شخصیتیں بھی شامل ہیں، علامہ فیضی اور موٴرخ بدایونی انکے علم وفضل کے قائل اور قدرداں تھے۔[۴]

حضرت صرفی نے دینی اور ادبی علوم پر عربی وفارسی میں ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اصول فقہ میں ان کا کارنامہ توضیح وتلویح پر عالمانہ حاشیہ ہے، یہ حاشیہ آج بھی موجود ہے، وہ غالی حنفی تھے، اس حاشیہ میں بھی انھوں نے اپنا مسلک موٴید کرنے میں پوری دلچسپی لی ہے۔

۱۔ تاریخ اعظمی ص ۲۱۶ ۲۔ تاریخ حسن ج ۳ ص ۲۵۳ ۳۔ تاریخ حسن ج ۳ ۴۔ سواطع الالہام ص ۶۳۹ و منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۴۰ و حیات صرفی، مولوی محمد شاہ سعادت مرحوم، لاہور ۱۳۰۹ھ ص ۷۶۔

زبدۃ الطب

ایک اہم طبّی مخطوطہ

از

جناب وسیم احمد اعظمی صاحب ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی مڈیسن نواب منزل، پٹنہ،

"زبدۃ الطب" خدابخش لائبریری پٹنہ کا ایک اہم طبی مخطوطہ ہے جس کو مشہور ایرانی طبیب سید اسماعیل جرجانی نے سلطان علاء الدین تکش خوارزم شاہ کے لیے عربی زبان میں تالیف کیا تھا۔ اس کے دوسرے اہم طبی کارنامے ذخیرۂ خوارزم شاہی، خفِ علائی اور الاغراض الطبیہ فارسی میں ہیں۔ جرجانی نے اپنی تمام فارسی طبی کتابوں کے برخلاف اس کو عربی زبان میں لکھا ہے، اور جداول کا بھی اہتمام کیا ہے، جرجانی زیادہ تر اپنی فارسی تالیفات سے مشہور ہوا، اسی لئے اس کے عربی طبی کارنامے "زبدۃ الطب" سے نہ صرف عوام بلکہ خواص کا بھی ایک بڑا طبقہ ناواقف ہے، اور بیشتر تذکرے زبدۃ الطب کے بارے میں خاموش ہیں، اس وقت اور بھی تعجب ہوتا ہے، جب ڈاکٹر ایڈورڈ جی براؤن جرجانی کی عربی طبی کتابوں کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ذخیرہ خوارزم شاہی کے علاوہ اس مصنف نے دیگر مقابلۃً مختصر طبی کتابیں بھی تالیف کی ہیں، جو تمام فارسی میں ہیں،" [1]

اور حکیم سید علی احمد نیر واسطی جیسے محقق اس تحریر پر بلا تبصرہ گزر جاتے ہیں، لیکن جب ہم عربی تذکروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو "زبدۃ الطب" کا ذکر جا بجا ملتا ہے، "الاعلام" میں [2]:

اسماعیل بن حسین الحسینی	اسماعیل بن حسین حسینی ابو ابراہیم زین الدین
ابو ابراہیم زین الدین الجرجانی	جرجانی جرجان کا ایک محقق

طبیب باحث من اہل جرجان	طبیب ہے جو خوارزم میں مقیم رہا اور
اقام فی خوارزم، وبہا صنف	وہاں اپنی یہ کتابیں تالیف کیں،
کتب الطب الملوکی والرد	الطب الملوکی، الرد علی الفلاسفہ
علی الفلاسفۃ وتدبیر یوم	وتدبیر یوم ولیلۃ اور زبدۃ الطب
ولیلۃ وزبدۃ الطب فی مجلد [3]	ایک جلد میں،

صاحب کشف الظنون کے لفظوں میں:-

"زبدۃ الطب" للخوارزم	خوارزم شاہی کی زبدۃ الطب میں
شاہی وہو مجدول مشتمل	جدول ہے، اور یہ بدن کے ظاہری
علی حقائق الابدان الظاہرۃ	حقائق اور اس کے باطنی دقائق پر
ودقائقہا الباطنۃ" [4]	مشتمل ہے۔

زبدۃ الطب کے دو [2] اور نسخوں کا ابتک پتہ چل سکا ہے، ایک نسخہ کی نشاندہی مکتبہ شرقیہ دار العلوم اسلامیہ پشاور کی مطبوعہ فہرست میں عدد مسلسل نمبر ۱۶۲ کے تحت محفوظ ہے، [5] دوسرا نسخہ رضا لائبریری رام پور میں اکسیشن نمبر ۵۵۹ کے تحت مندرج ہے [6]۔

نام کتاب | تذکروں میں "زبدۃ الطب" تحریر ہے۔ جرجانی نے بھی اکثر جگہوں پر "زبدۃ الطب" ہی لکھا ہے، لیکن مخطوطہ کے ورق نمبر ۳ الف پر "کتاب الزبدۃ فی الطب" لکھا ہوا ہے، نسخہ رامپور کا بھی یہی نام ہے [7]۔

نام مصنف | جرجانی کے نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے

(۱) اسماعیل بن حسین الحسینی ابو ابراہیم زین الدین الجرجانی [8]

(۲) الشریف شرف الدین اسماعیل [9]

(۳) السید الحکیم ابو ابراھیم اسماعیل بن محمد الحسینی[109]۔ (۴) السید الامام زین الدین اسماعیل حسینی[110]۔ (۵) اسماعیل بن حسن حسینی ملقب بزین الدین[111]۔ (۶) زین الدین اسماعیل بن حسین[112]۔

ڈاکٹر عبدالمقتدر خاں نے بھی اسی آخری نام کو درج کیا ہے[113]۔

حالات جرجانی کے حالاتِ زندگی بہت کم ملتے ہیں، سنہ پیدائش کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ملتی، الگڈ کے خیال میں ابن ابی صادق کی ضعیفی کے ایام میں ان کا شاگرد ہوا[114]۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو اس کی پیدائش کا زمانہ گیارہویں صدی عیسوی ہے۔

جرجانی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اس دور میں عرب و عجم کی سیاسی کشمکش ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گئی تھی، عربوں کا اقتدار دم توڑ رہا تھا، اور عجمیوں میں بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی، جس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں تغیر و انقلاب رونما ہو رہا تھا، جس کا اثر زبان و بیان پر بھی پڑا، طب کا تمام تر سرمایہ عربی زبان میں تھا، مگر اب یہ عجمی زبانوں میں منتقل ہونے لگا، جرجانی نے وقت کی رفتار سے متاثر ہو کر فارسی کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا، اور غالباً وہ پہلا شخص ہے جس نے طب عربی کو باقاعدہ فارسی جامہ پہنایا،

رفتہ رفتہ جرجانی کی شہرت خوارزم شاہ کے دربار تک پہنچی، اس نے جرجانی کو دربار میں بلا کر ملازمت کی پیش کش کی۔ جرجانی ۵۰۴ھ میں خوارزم گیا اور ایک ہزار دینار مشاہرہ پر شاہ کی ملازمت کرلی، اس طرح جرجانی کو تصنیف و تالیف کے لئے ایک پرسکون اور مناسب ماحول مل گیا، اور وہ بڑی جانفشانی سے طبی خدمات انجام دینے لگا۔

جرجانی کے سنہ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے اقوال مختلف ہیں، ابن ابی اصیبعہ کے خیال میں اس کا انتقال خوارزم شاہ کے زمانے میں ہوا[115]۔ الگڈ لکھتا ہے کہ وہ مرو میں ۱۱۳۶ء یا ۱۱۳۰ء میں فوت ہوا[116]۔ درۃ الاخبار اور تتمہ صوانۃ الحکمۃ میں ۵۳۱ھ مطابق ۱۱۳۶-۳۷ء میں اُسے سرخس میں دیکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ اس کی عمر کے آخری ایام تھے[117]۔

ڈاکٹر عبدالمقتدر خاں نے خدا بخش لائبریری کیٹلاگ جلد ۱، صفحہ ۴۲ میں مختلف حوالوں سے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے ہیں :-

۱۔ جرجانی نے ایک طویل مدت تک خوارزم میں قیام کیا اور اس کے بعد مرو گیا، جہاں ۵۳۱ھ مطابق ۱۱۳۶-۳۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

۲۔ حاجی خلیفہ نے جرجانی کا سنہ وفات ایک جگہ ۵۳۰ھ مطابق ۱۱۳۵-۳۶ء دوسری جگہ ۵۳۱ھ مطابق ۱۱۳۶-۳۷ء اور تیسری جگہ ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰-۴۱ء درج کیا ہے۔ اس طرح یقینی طور پر جرجانی کے سنہ ولادت و وفات کی تعیین نہیں کی جاسکتی، لیکن حاجی خلیفہ کے دوسرے قول کو بیشتر تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے،

ضخامت اور سائز کی تفصیل اس طرح ہے :-

ورق	ورق کا سائز	حوض کا سائز
ایک سو چون ۱۵۴	۳۳×۲۸ سینٹی میٹر	۲۲×۱۸ سینٹی میٹر

کتابت: نسخہ قدیم خط نسخ میں ہے، ورق ۱ الف پر اکیس سینٹی میٹر کا ایک خوبصورت نقش و مذہب دائرہ بنا ہے جس میں پھول نما چالیس زاویئے ہیں، دائرہ میں سنہری حروف میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے۔

"بخزانۃ کتب الملک المعظم العالم العادل المؤید المظفر المنصور صلۃ الدولۃ والدین سعد الاسلام والمسلمین اعداد الملوک فی العالمین، سلطان السعداۃ والنقباء

مربی الملوک والصدور والفضلاء مہدی بن الحسن
الحسینی اعز اللہ انصارہ وضاعف اقتدارہ"

مندرجۂ بالا عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مہدی بن الحسن الحسینی کے کتب خانہ کی زینت رہ چکا ہے جس سے اس کی قدامت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی کتابت محمود السمنانی کے ہاتھوں ہوئی ہے، لیکن اوراق کے کرم خوردہ ہونے کے سبب پورا نام نہیں پڑھا جاسکا، عبارت کچھ اس طرح ہے

"و...... (غیر واضح۔ کرم خوردہ) فرغ من انتساخہ
العبد الضعیف الراجی رحمۃ ربہ .... (غیر واضح
کرم خوردہ) وقت الضحیٰ ...... (غیر واضح کرم خوردہ) الثانی
والعشرون شہر جمادی الاولیٰ من شہور سنۃ سبعین وستمائۃ
محمود...... (غیر واضح کرم خوردہ) السمنانی الحمد للہ
والصلوٰۃ .... (غیر واضح کرم خوردہ)

"محمود" کے بعد "ع" واضح ہے، بعد کے حروف کرم خوردہ ہیں، پھر "السمنانی" واضح ہے۔ اس طرح گویا زبدۃ الطب کی کتابت ۲۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۶۷۰ ہجری میں نسخہ قدیم میں محمود السمنانی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔

نسخہ مذکورہ کے اضافی ورق نمبر ۲ پر تین اضافی تحریریں ملتی ہیں جو خاصی قدیم ہیں ان میں سے اول الذکر دو زبدۃ الطب کے سنہ تالیف، اس کے مصنف اور اس کی کتابت سے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، آخر الذکر کا تعلق مخطوطہ کی شیرازہ بندی سے ہے۔ اضافی تحریر نمبر ۱ کے راقم کوئی ابو القاسم ہیں لکھتے ہیں:۔

تصنیف زبدہ در سنہ پانصد ونود ہجری است۔	زبدہ کی تصنیف سنہ ۵۹۰ھ میں ہوئی۔

وہ لکھتے ہیں:

این کتاب ہفتاد سال تقریباً بعد از تصنیف نوشتہ شدہ	یہ کتاب زمانہ تصنیف کے تقریباً ستر سال بعد تحریر کی گئی ہے۔

اضافی تحریر نمبر ۱ کے مطابق زبدۃ الطب کی تصنیف سنہ ۵۹۰ھ میں ہوئی جو کہ درست نہیں ہے، کیونکہ ہم نے مختلف حوالوں سے ابھی ثابت کیا ہے کہ جرجانی کا انتقال سنہ ۵۳۱ھ میں ہوا، اگر ہم اضافی تحریر نمبر ۱ کو مستند تصور کرتے ہیں تو زبدۃ الطب کا سنہ تالیف جرجانی کے انتقال کے ۵۹ سال بعد قرار پاتا ہے، اور یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی، اسی طرح اضافی تحریر نمبر ۲ کے مطابق یہ نسخہ مولف کے انتقال کے تقریباً ستر سال بعد یعنی سنہ ۶۰۱ھ کے قریب نقل کیا گیا۔ جب کہ اس کے کاتب محمود السمنانی لکھتے ہیں کہ ۲۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۶۷۰ھ کو اس کی تکمیل ہوئی۔

سید اطہر شیر خدا بخش لائبریری کے عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز جلد ۳ صفحہ الف میں عربی نوادر کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے زبدۃ الطب کے بارے میں لکھتے ہیں:

زبدۃ الطب در فن طب است	زبدۃ الطب فن طب کی کتاب ہے
مولفہ سید اسماعیل الجرجانی	اس کے مولف سید اسماعیل جرجانی ہیں،
این کتاب برائے سلطان خوارزم شاہ در سال سنہ ۶۷۰ھ یعنی چہل سال بعد وفات مولف نقل شدہ بود	اور یہ نسخہ سلطان خوارزم شاہ کے لئے سنہ ۶۷۰ھ میں یعنی مولف کی وفات کے چالیس سال بعد نقل ہوا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبدۃ الطب کا نسخہ ۵۷۱ھ میں مولف کے انتقال کے چالیس سال بعد سلطان خوارزم شاہ کے لئے نقل کیا گیا، چند سطور پہلے ہم نے جرجانی کی وفات مستند روایات کے مطابق ۵۳۱ھ قرار دی ہے۔ اس حساب سے یہ نسخہ جرجانی کے انتقال کے تقریباً ایک سو انتالیس[۱۳۹] سال بعد نقل کیا گیا۔

ہمیں مخطوطہ میں کہیں بھی اس طرح کے اشارات نہیں ملتے، جن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ اس کو اضافی تحریر ۲ کے مطابق جرجانی کے انتقال کے تقریباً ستر سال بعد یا سید اطہر شیر کی تحقیق کے مطابق خوارزم کے کسی سلطان کے لئے مولف کی وفات کے چالیس[۱۴] سال بعد نقل کیا گیا ہے۔ اس طرح اضافی تحریر ۱، ۲ نیز سید اطہر شیر کی تحقیق درست نہیں ہوسکتی،

مخطوطہ کی موجودہ حالت نسخہ آب زدہ اور کرم خوردہ ہے، نیز قدامت کی وجہ سے بعض حروف اڑ گئے ہیں، بعض عبارتیں جلد سازی کی وجہ سے چھپ گئی ہیں۔ اس لئے ابواب ومباحث کی تعیین میں مولف کی بعینہٖ پیروی نہیں ہوسکتی، اور ان مباحث کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے طور پر ابواب کی تعیین پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعض ورق اپنی اصل ترتیب کے مطابق نہیں ہیں، کہیں کہیں ورق الٹے لگ جانے کی وجہ سے ورق [illegible] الف کی جگہ [illegible] ب اور ورق [illegible] ب کی جگہ ورق [illegible] الف ہو گیا ہے۔

آغاز کتاب کتاب کا آغاز حمد وثنا سے ہوتا ہے، اس کے بعد مصنف نے تقریباً ایک صفحہ میں فن طب اور اس کے مبادیات پر روشنی ڈالی ہے نیز کتاب کے مشمولات، شاہ وقت کی طرف انتساب اور کتاب کا نام وغیرہ تحریر کیا ہے۔

تقسیم مباحث جرجانی نے کتاب کے آغاز میں اس کے مباحث کا اجمالی ذکر کیا ہے اور ہر بحث کو "کتاب" کا نام دیا ہے، انھوں نے اس میں "جدول" کے انداز میں "حفظ الصحۃ" کے نام

سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبدۃ الطب کی تالیف کے دوران انھیں ابن بطلان[۵۱۹] کی کتاب تقویم الصحۃ کافی پسند آئی کیونکہ یہ بھی جدول کے انداز میں لکھی گئی تھی، اور چونکہ جرجانی کا ارادہ بھی اسی طرح کی کتاب لکھنے کا تھا، اور اسکے مقاصد کی تکمیل ابن بطلان کی "تقویم الصحۃ" سے بخوبی ہو رہی تھی اس لئے اس نے ایک جمالیاتی توضیح کے سہارے ابن بطلان کی کتاب "تقویم الصحۃ" کو زبدۃ الطب میں شامل کرنے کا ارادہ کیا، زبدۃ الطب کے ورق ۴۳ الف پر لکھتا ہے

"کتاب کے آغاز میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ جدول کے انداز میں "حفظ الصحۃ" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھوں گا، لیکن پھر مناسب تصور کیا کہ الشیخ ابوالحسن ابن البطلان الطبیب البغدادی کی کتاب "تقویم الصحۃ" کو ہی بر سبیل تضمین شامل کروں، کیونکہ تضمین کو جب اشعار میں مستحسن خیال کیا تو نثری تصانیف میں قبیح تصور کرنے کا کوئی جواز نہیں ہونا چاہیئے، تضمین کی طرف میرا میلان اس لئے بھی ہوا کہ اگر حسب وعدہ بذات خود "حفظ الصحۃ" پر جدول کے انداز میں کوئی کتاب لکھتا تو وہ "تقویم الصحۃ" سے بہتر نہ ہوتی اور غیر معمولی تکلفات بھی ہوتے"[۵۲۰]

مزید لکھتے ہیں

"طب تو ایک ہی ہے، ہاں اس قدر ضرور ہے کہ کتابوں کو اسلوب نگارش، ندرت انتخاب، بسط واختصار کی خوبی کے لحاظ سے بلاشبہ مختلف زمروں میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ "تقویم الصحۃ" میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں، لہذا اسکی تضمین مستحسن اور اس پر انحصار بہتر ہے"[۵۲۱]

موجودہ صورت میں زبدۃ الطب میں مندرجہ ذیل مباحث یا کتابیات شامل ہیں

۱۔ جزر علمی :۔ اس کو "القسم الاول" بھی لکھا گیا ہے۔ اس سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے، یہ ۹ مقالات پر مشتمل ہے۔ اختتام ورق ۲۶ الف پر ہوتا ہے۔

۲۔ کتاب التشریح :۔ اعضاء مفردہ و مرکبہ کی تشریح پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۵۶ الف پر ہوتا ہے۔

۳۔ کتاب الحمیات :۔ سات[۵۲۲] اجزاء پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۶۲ ب پر ہوتا ہے۔

۴۔ کتاب المعالجات :۔ اس کو "القسم الثانی" بھی لکھا گیا ہے، بیس مقالات پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۳۷ ب پر ہوتا ہے،

۵۔ کتاب البثور والاورام :۔ پانچ مقالات پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۴۵ الف پر ہوتا ہے

۶۔ کتاب الزینة :۔ تین اجزاء پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۴۷ الف پر ہوتا ہے۔

۷۔ کتاب فی السموم والادویہ[۵۲۳] :۔ چھ مقالات پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۵۴ پر ہوتا ہے، کتاب کا اختتام بھی اسی بحث پر ہوتا ہے۔ اس طرح زبدة الطب میں سات مختلف مباحث یا کتابیات ہیں، لیکن "تقویم الصحة" کے نام سے کوئی کتاب نہیں ملتی، مقدمہ یا تمہید میں "کتاب الحمیات" کا ذکر نہیں ہے، لیکن تفصیل میں کتاب الحمیات شامل ہے، جس کے اختتام پر جرجانی 'ابن بطلان' کی کتاب "تقویم الصحة" کو بطور تضمین زبدة الطب میں شامل کرنے کی بات کرتے ہیں، لیکن فوراً جس کتاب کا آغاز ہوتا ہے وہ معالجات سے متعلق ہے، اور عبارت اس طرح ہے :۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ القسم الثانی من کتاب زبدة الطب فی المعالجات"[۵۲۴]

اس کا اختتام ورق ۱۳۷ ب پر ہوتا ہے۔ الفاظ مندرجۂ ذیل ہیں :۔

تم کتاب معلجات الاعضاء	سر سے پا تک کے اعضاء کی معالجات
من الراس الی القدم بحمد اللہ	کی کتاب بحمد اللہ اس کی توفیق سے
وحسن توفیقہ"[۵۲۵]	مکمل ہو گئی

آغاز و اختتام کی عبارتیں واضح طور پر اس بحث کو "کتاب المعالجات" قرار دیتی ہیں، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے اس نسخہ میں جرجانی کو لکھنے کے باوجود ابن بطلان کی کتاب "تقویم الصحة" کا انضمام نہ ہو سکا ہے، اگر کتاب الحمیات کو "تقویم الصحة" قرار دیتے ہیں تو یہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ تقویم الصحة کا ایک قلمی نسخہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے جو بڑی تقطیع کے چوراسی[۵۲۶] صفحات پر مشتمل ہے جس میں ادویہ کے مزاج، افعال و خواص کا ذکر ہے[۵۲۷] جب کہ کتاب الحمیات مکمل طور پر حمیات سے متعلق ہے، اس طرح یہ شبہ یقین کی حد کو پہنچتا ہے کہ اس نسخہ میں ابن بطلان کی کتاب تقویم الصحة شامل نہیں ہے،

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اصل کتاب کے آغاز سے قبل کی اول الذکر دونوں اضافی تحریریں یہاں بھی تحقیق کی راہ میں دشواریاں پیدا کرتی ہیں، مثلاً اضافی تحریر جس کے راقم ابو القاسم نام کے کوئی بزرگ ہیں لکھتے ہیں

این کتاب زبدة الطب از ابتدا	یہ کتاب زبدة الطب ابتدا سے معالجات
تا شروع معالجات جزویہ تصنیف	جزویہ کے شروع تک سید اسماعیل
سید اسماعیل جرجانی است کہ برائے	جرجانی کی تصنیف ہے جو سلطان
سلطان علاء الدین تکش خوارزم	علاء الدین تکش خوارزم شاہ کے لئے
شاہ تصنیف نمودہ، و معالجات	لکھی گئی ہے، اور معالجات جزویہ
جزویہ تصنیف ابو الحسن مختار بن	ابو الحسن مختار بن حسن مشہور با بن
حسن مشہور بہ ابن بطلان است	بطلان کی تصنیف ہے۔ جس کا نام
نامش تقویم الصحة است کہ سید	تقویم الصحة ہے، سید اسماعیل نے اسے
مذکور با کتاب خود تضمین ساختہ[۵۲۸]	اپنی کتاب میں بطور تضمین شامل کیا،

اضافی تحریر نمبر ۳ اضافی تحریر نمبر ۱ کے بعد کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اسکی عبارت اس طرح ہے.

"این کتاب ہفتاد سال بعد از تصنیف	یہ کتاب تصنیف کے ستر سال بعد
نوشتہ شد و مصنفش تا آخر معالجات	نقل کی گئی ہے، معالجات کلیہ تک
کلیہ سید اسماعیل جرجانی مصنف	کے مباحث کے مصنف سید اسماعیل
کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی است،	جرجانی ہیں جو ذخیرہ خوارزم شاہی کے
و مصنف معالجات جزویہ است	بھی مصنف ہیں اور معالجات جزویہ
ابن بطلان نصرانی، صاحب کتاب	کے مصنف ابن بطلان نصرانی ہیں جو
تقویم الابدان" [۲۸]	تقویم الابدان کے مصنف ہیں

اضافی تحریر نمبر ۲ میں زبدۃ الطب کا تعارف کرانے کے لئے "مصنف کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی" اور "تقویم الصحۃ" کو مزید تعارف کرانے کے لئے "صاحب کتاب تقویم الابدان" تحریر ہے، اس میں شک نہیں کہ "تقویم الصحۃ" کا مولف مختار بن عبدون المتطبیب الشہیر بہ ابن بطلان ہے، لیکن "تقویم الابدان" کو اس سے منسوب کر دینا درست نہیں، کیونکہ اس کا مولف مشہور طبیب ابن جزلہ ہے، کشف الظنون میں ہے

تقویم الابدان فی تدبیر الانسان	ابوالحسن علی بن عیسی ابن جزلہ
فی الطب لابی الحسن علی بن	المتطبیب البغدادی المتوفی
عیسی ابن جزلہ المتطبیب البغدادی	۴۹۳ھ کی تقویم الابدان
المتوفی سنہ ۴۹۳ھ [۲۹]	فی تدبیر الانسان،

خدابخش لائبریری پٹنہ میں تقویم الابدان کے کئی نسخے موجود ہیں، اور سبھی ابن جزلہ سے

منسوب ہیں، رضا لائبریری کا نسخہ بھی ابن جزلہ سے ہی منسوب ہے، اس لئے اضافی تحریر نمبر ۲ کی یہ اطلاع درست نہیں مانی جا سکتی۔

اضافی تحریر نمبر ۱ مرقومہ ابوالقاسم معالجات جزویہ کو "تقویم الصحۃ" قرار دیتی ہے، خدابخش لائبریری کی فہرست کے مرتب بھی ابوالقاسم کی تحریر سے مطمئن ہیں [۳۰]، جب کہ اضافی تحریر نمبر ۲ اس بارے میں خاموش ہے، لیکن دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ "معالجات جزویہ" ابن بطلان کی تالیف ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "معالجات جزویہ" ہی "تقویم الصحۃ" ہے یا یہ ابن بطلان کی کوئی علٰحدہ تصنیف ہے؟ حیدرآباد دکن میں موجود ابن بطلان کی کتاب "تقویم الصحۃ" کا نسخہ موضوع کے لحاظ سے "معالجات جزویہ" سے بالکل مختلف ہے [۳۱]۔ اور ہمارے پاس کوئی ایسا مستند ماخذ نہیں جس کی روشنی میں "معالجات جزویہ" کو ابن بطلان کی کوئی مستقل تالیف قرار دیا جا سکے، اس کے برخلاف زبدۃ الطب کی ابتدائی سطور میں جرجانی نے کتاب المعالجات (معالجات جزویہ) کو اپنی تالیف میں شمار کیا ہے، ایسی صورت میں کوئی جواز نہیں کہ "معالجات جزویہ" کو ابن بطلان کی طرف منسوب کر دیا جائے، اور دونوں اضافی تحریروں اور سید اطہر شیر، فہرست خدابخش لائبریری پٹنہ کی فہرست کے مرتب کی تحقیق کو درست مان لیا جائے۔

مذکورہ بحث کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خدابخش لائبریری پٹنہ کا یہ گرانقدر طبی مخطوطہ سید اسماعیل جرجانی کی ہی تالیف ہے جس کی اہمیت ایک قدیم دستاویز ہی کی نہیں ہے، بلکہ موضوعات کے اعتبار اور پیشکش کے انداز سے بھی یہ بے مثال خوبیوں کا حامل ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کو مرتب کر کے شائع کرایا جائے !!!

حوالے وکتابیات

ھ۱ طب العرب ص ۱۲۹، ترجمہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی۔ ھ۲ الاعلام ج ۱ ص ۳۰۸۔ خیرالدین زرکلی۔ ھ۳ کشف الظنون ج ۳ ص ۵۳۷، حاجی خلیفہ، ھ۴ مطبوعہ فہرست مکتبہ مشرقیہ دارالعلوم اسلامیہ پشاور ص ۳۰۴ مرتبہ مولوی عبدالرحیم ھ۵ رضا لائبریری رامپور کیٹلاگ ج ۵ ص ۲۸۳ ۲۸۲، مرتبہ سید امتیاز علی عرشی ھ۶ ایضاً ج ۵ ص ۲۸۳، ۲۸۲، سید امتیاز علی عرشی۔ ھ۷ الاعلام ج ۱ ص ۳۰۸ خیرالدین زرکلی۔ ھ۸ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ج ۲ ص ۱۳۱، ابن ابی اصیبعہ ھ۹ روضۃ الجنات ص ۴۴۳۔ بحوالہ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا، ھ۱۰ درۃ الاخبار ص ۱۰۰، بحوالہ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا۔ ھ۱۱ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا۔ ھ۱۲ کشف الظنون ج ۳ ص ۳۳۰، حاجی خلیفہ ھ۱۳ خدابخش لائبریری کیٹلاگ ج ۱× ص ۲، عبدالمقتدر خان۔ ھ۱۴ اے میڈیکل ہسٹری آف پرشیا ص ۲۱۸، الگڈ۔ ھ۱۵ عیون الانبار فی طبقات الاطبار ج ۲ ص ۳۲، ابن ابی اصیبعہ۔ ھ۱۶ اے میڈیکل ہسٹری آف پرشیا ص۔ الگڈ ھ۱۷ بحوالہ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا۔ ھ۱۸ مفتاح الکنوز ج ۳ ص الف سید اطہر شیر۔ ھ۱۹ مفتاح الکنوز ج ۳ ص ۱۹۲ مرتبہ سید اطہر شیر میں "بطلان" بالیین تحریر ہے جو غلط ہے۔ ھ۲۰ زبدۃ الطب ورق ۳۲ الف، سید اسماعیل جرجانی ھ۲۱ ایضاً ورق ۳۲ الف۔ ھ۲۲ فہرست میں "وھی خمسۃ اجزاء" تحریر ہے جو درست نہیں۔ ھ۲۳ حروف جلد سازی کی وجہ سے چھپ گئے ہیں۔ ھ۲۴ زبدۃ الطب

ورق ۳۲ الف، سید اسماعیل جرجانی۔ ھ۲۵ ایضاً ورق ۳۲ ب۔ ھ۲۶ طب اسلامی ص ۴۷ از مولانا ابن مظہر فاروقی بحوالہ طب العرب ص ۳۱۶ از حکیم نیر واسطی۔ ھ۲۷ زبدۃ الطب اضافی ورق ۲ الف۔ ھ۲۸ ایضاً اضافی ورق ۲ الف، زبدۃ الطب ورق ۱۵۴ الف۔ ھ۲۹ کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹۱ حاجی خلیفہ۔ ھ۳۰ مفتاح الکنوز ج ۳ مرتبہ سید اطہر شیر۔ ھ۳۱ طب اسلامی ص ۴۷، ابن مظہر فاروقی بحوالہ طب العرب ص ۳۱۶ از حکیم سید علی احمد نیر واسطی

باب التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

نقوش ادبی معرکے نمبر مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب، متوسط کتابی سائز، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۶۳۲ و ۵۶۷ مجلد، قیمت عام ایڈیشن ۹۰ روپے (دونوں جلدیں)، لائبریری ایڈیشن ۱۵۰ روپیہ، پتہ:۔

ادارہ فروغ اردو لاہور (پاکستان)

ضخیم، بلند پایہ اور معیاری خاص نمبروں کی اشاعت نقوش (لاہور) کا طرۂ امتیاز ہے، جس میں اردو کا کوئی رسالہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے ابتک درجنوں خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں جو سب کے سب اہم اور عظیم الشان ہیں، ادھر ایک دو برس کے اندر اسکے کئی خاص نمبر ہم کو ملے ہیں، ان میں رسول نمبر کی دس جلدیں بھی ہیں جن پر آئندہ کسی اشاعت میں تبصرہ شائع ہوگا، پیش نظر نمبر بھی صاحب نقوش کا اہم بالشان کارنامہ ہے جو دو جلدوں اور تقریباً تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے، اسکی پہلی جلد میں زبان وادب اور اسکی تحقیق کے نام پر ہونیوالے معرکوں یعنی اصحاب علم وفن کے مختلف نقطۂ نظر کا خلاصہ مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے، دوسری جلد میں مختلف شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کے درمیان ہونیوالی نوک جھونک اور معرکہ آرائی کا ذکر ہے، پہلی جلد کی ابتدا زبان کے نام پر ہونیوالے بعض اختلافات اور معرکوں سے کی گئی ہے، اس سلسلہ کی پہلی بحث اردو زبان کے وجود میں آنے کے اسباب اور اسکے مولد سے متعلق ہے: اسکی ابتدا مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کے ایک اقتباس سے کی گئی ہے، اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ، حافظ محمود شیرانی، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین، شیخ عبد القادر اور دوسرے اہل قلم کی کتابوں اور مضامین کے اقتباسات دیے گئے ہیں، پھر ملک کی زبان کیا ہو اردو

ہندی یا ہندوستانی؟ ملک کی تقسیم کے زمانہ میں یہ مسئلہ مولوی عبد الحق صاحب اور گاندھی جی کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا تھا جس میں گاندھی جی کے خاص دست راست بابو راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند تھے، ان کے اور مولوی عبد الحق صاحب کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے جن لوگوں کے خیالات اس زمانہ میں نشر ہوئے تھے اُن میں ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور بیرسٹر آصف علی بھی تھے، لائق مرتب نے ان سب کی تقریریں نقل کی ہیں، اسی ضمن میں رسم الخط کے مسئلہ پر مولوی صاحب اور گاندھی جی کے علاوہ محمد الیاس برنی، پرشوتم داس ٹنڈن، مولوی عبد القدوس ہاشمی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرے باب میں مختلف صوبوں سے اردو کے تعلق کی نوعیت پر اردو کے مصنفین ومحققین کے خیالات کی تلخیص پیش کی ہے، چنانچہ پنجاب (حافظ محمود شیرانی) دکن ومدراس (نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین زور) گجرات (مولانا سید سلیمان ندوی) دلی (محمد حسین آزاد و شیرانی) بہار (ڈاکٹر اختر اورینوی) بنگال (سید وقار عظیم) میسور (پروفیسر محمد خاں) اس بحث میں حصہ لینے والوں میں ڈاکٹر عبد الحق، حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر چٹرجی، حامد حسن قادری، مسٹر گنگا سہائے، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نام بھی قابل ذکر ہیں، اسی حصہ میں دو اہم مضامین "اردو اور دیسی زبان" (از پنڈت برجموہن دتاتریہ) اور قومی زبان (سید ہاشمی فرید آبادی) درج ہیں، تیسرے اور چوتھے باب میں تحقیق اور شعر وادب کے نام پر معرکوں کا حال بیان ہوا ہے، اس میں پہلے گارساں دتاسی کے تذکرۂ شعرائے اردو پر مولوی محفوظ الحق اور قاضی عبد الودود کے معرکوں کی تفصیل دی ہے پھر نواح دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابوں مثنوی واقعات امامیہ اور دیوان منتظم تجاروی پر مندرجۂ ذیل حضرات کے مباحثے کا ذکر ہے، ڈاکٹر رشید الدین، نصیر الدین ہاشمی، محمد خلیل تجاروی اور ڈاکٹر نور الحسن

ہاشمی یہ بحث ۱۹۲۴ء و ۱۹۲۵ء کے معارف سے ماخوذ ہے، اس کے بعد مندرجۂ ذیل موضوعات پر ادبی و تحقیقی معرکے درج ہیں نقد متروکات" (برج موہن دتاتریہ کیفی، احسن مارہروی اور منوہر لال زتشی) ترکیب اضافی میں "کی" اور "کے" کا استعمال (مولوی عبدالحق، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور حبیب اللہ غضنفر) "گنجینۂ تحقیق" (سید محمد احمد بیخود موہانی اور مولوی اقبال احمد سہیل) "فارسی میں یائے معروف و مجہول" (سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی اور شیخ عبدالقادر) "قواعد اردو" از مولوی عبدالحق صاحب (مولوی عبدالغنی، ظفر الملک، قمر احمد، قاضی محمد عارف اور خواجہ عبدالرؤف) ادب الکاتب (علی حیدر طباطبائی، حامد اللہ افسر، سلیم جعفر اور انیس مجتبیٰ صہبا مارہروی) یہ سب مضامین اہم ہیں، اوران سے زبان و ادب کے متعلق مختلف نکتے اور بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، پھر ہجری و عیسوی تاریخوں کی مطابقت کے مسئلہ پر پروفیسر مہیش پرشاد اور حکیم شمس اللہ قادری کے معرکے درج ہیں، اسی طرح مرزا قتیل کے وطن کے متعلق بعض محققین کے نقطۂ نظر کا ذکر ہے، "پھر نغمہ گانا" درست زبان ہے یا نہیں کے بارہ میں مختلف ادیبوں کی موافق و مخالف رائیں نقل کی گئی ہیں، اسی حصہ میں استفسارات ادبی و شعری کے زیر عنوان مختلف جواب درج ہیں "اور تسہیل بلاغت" نام کی ایک کتاب پر تبصرہ بھی ہے، اس میں مرزا محمد سجاد مرزا اور اثر لکھنوی کی نوک جھونک کا ذکر ہے، "ملتان سے لکھنؤ" کے زیر عنوان مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیف خیام پر ڈاکٹر تاثیر کے بعض شکوک "اور سفر افغانستان" کے متعلق جناب اسد ملتانی کے چند شبہات نقل کر کے ان کے متعلق پہلے سید صاحب کی وضاحت درج ہے اور آخر میں اسد صاحب کے جواب میں مولانا ابوظفر ندوی مرحوم کا ایک مضمون بھی دیا گیا ہے، اسی حصہ میں اصلاح سخن" نام کی ایک کتاب کا ذکر بھی آگیا ہے، اس میں شوق سندیلوی کی سولہ غزلوں پر بیالیس اساتذہ کی اصلاح درج ہے، آخر میں اصل موضوع یعنی ادبی معرکے پر حسب ذیل تین مفید مضامین شائع

کئے گئے ہیں (۱) ادبی معرکوں میں روایت (ڈاکٹر محمد یعقوب) (۲) ادبی معرکوں کی کہانی (از امیر حسن نورانی) (۳) فارسی شعراء کی معرکہ آرائیاں (از ڈاکٹر عبدالحمید یزدانی)، دوسری جلد کے پہلے حصہ میں شخصی معرکوں کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، ان معرکوں کے متعلق جو مضامین درج ہیں ان کی مختلف نوعیتیں ہیں جیسے میر، سودا، غالب، ناسخ، عبدالغفور نساخ، ڈاکٹر اقبال، ریاض خیر آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کے ان کے مختلف معاصرین سے جو معرکے ہوئے ان کی تفصیل دی گئی ہے، دوسری نوعیت کے مضامین میں دو دو اشخاص کے درمیان ہونے والے معرکوں کا حال درج ہے مثلاً مصحفی اور سودا کا معرکہ، انشا اور مصحفی کا معرکہ، ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے، انیس و دبیر کے معرکے، شرر و چکبست کے معرکے، جلال، تسلیم اور ولا کی معرکہ آرائی، حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک، جلال لکھنوی اور شوق نیموی کے معرکے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے معرکے، چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر کا معرکہ اور جوش و شاہد کا معرکہ، تیسری نوعیت ان مضامین کی ہے جن میں کسی ایک مسئلہ پر مختلف حضرات نے اظہار خیال کیا ہے جیسے اقبال کے ایک شعر پر رشید احمد صدیقی، مولانا دریابادی، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، مہر، سالک، ضیا احمد بدایونی اور شورش کاشمیری کی رائیں پیش کی گئی ہیں، اس جلد کے دوسرے حصہ میں مولوی عبدالباری آسی کے تذکرہ معرکۂ سخن" سے چند ادبی معرکے پیش کئے گئے ہیں، یہ تذکرہ نیاز فتحپوری کا مرتب کیا ہوا ہے، اس میں جن شعراء کے اشعار پر بعض اہل نظر نے اعتراضات کئے تھے ان کی تفصیل دی گئی ہے مثلاً آتش کے بعض اشعار پر خود اپنے اعتراضات نقل کئے ہیں، اسی طرح میر درد پر آزاد اور اصغر پر اثر کے اعتراضات تحریر کئے ہیں، آسی نے جا بجا خود بھی اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ اعتراضات درست ہیں یا نہیں، آسی کے تذکرہ کا محاکمہ علامہ اطہر ہاپڑوی نے کیا ہے

اس نمبر میں وہ بھی شامل کیا گیا ہے، یہ دونوں چیزیں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہیں، اس جلد کی ایک خاص چیز معرکہ آرائی پر امام بخش صہبائی کی ایک کتاب "قول فیصل" اور "قول فیصل اس کا پس منظر" (از ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام) بھی ہے، دوسری جلد کے شروع میں "شاعرانہ اور معاصرانہ چشمکیں" کے زیر عنوان ایک مبسوط اور دلچسپ مقالہ بھی درج ہے، یہ بات کھٹکتی ہے کہ بعض مباحث کے سلسلہ میں مرتب کا رجحان کھل کر سامنے آگیا ہے مثلاً "پنجاب میں اردو" کے سلسلہ میں وہ حافظ شیرانی کے ہمنوا، اور اردو ہندی اور ہندستانی کے مسئلہ میں گاندھی جی کے مخالف نظر آتے ہیں، نزاع کا لفظ مونث ہے، مرتب نے اسے کئی جگہ مذکر لکھا ہے۔

نقوش کے اور نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی فاضل مرتب کا شاندار کارنامہ ہے، انھوں نے ادب، زبان اور تحقیق کی ان بحثوں کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے، جو اب فراموش کی جا چکی تھیں، اس حیثیت سے یہ نمبر ایک اہم علمی و ادبی دستاویز ہے۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڑھ

نام مقام اشاعت	:	دار المصنفین اعظم گڑھ
نوعیت اشاعت	:	ماہانہ
نام پرنٹر	:	اقبال احمد
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	دار المصنفین اعظم گڑھ
نام پبلشر	:	
اڈیٹر	:	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	:	ہندوستانی
نام و پتہ مالک رسالہ	:	دار المصنفین اعظم گڑھ

میں اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ اقبال احمد

مطبوعات جدیدہ

نواب صدیق حسن خاں :- مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۹۴ مجلد قیمت ۶۵ روپیے، پتے (۱) صغر منزل، بدھوارہ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵ (۳) سید فرحت علی الفرح C/۲۰۹، فیڈرل بی ایریا، بلاک ۲، کراچی ۳۸، پاکستان۔

نواب صدیق حسن خاںؒ ذو الریاستین تھے، امارت و ریاست کے ساتھ انھوں نے علم و فن سے بھی مکمل اشتغال رکھا، ان کی تصنیفات سینکڑوں سے متجاوز اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں، نادر و نایاب علمی و دینی کتب کی اشاعت، دین صحیح اور عقائد حقہ کی ترویج اور شرک و بدعت کے استیصال میں ان کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں اور اس اعتبار سے ہندستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام میں ان کی شہرت ہے، عرصہ ہوا نواب صاحب کے خلف الرشید نواب علی حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلما نے مآثر صدیقی کے نام سے اردو میں ان کی مبسوط سوانحعمری لکھی تھی، ادھر عربی میں بھی ان پر تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے، اور اب بھوپال کی ڈاکٹر رضیہ حامد نے یہ تحقیقی مقالہ اردو میں لکھ کر بھوپال یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، یہ نو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس میں ولی اللٰہی تحریک کے کارناموں کا خاص طور پر ذکر کر کے اس سے نواب صاحب کے تاثر و تعلق کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرے

باب میں نواب صاحب کے خاندان، اس کی مختلف شاخوں اور اس کی اہم شخصیتوں کا تذکرہ ہے، تیسرے باب میں نواب صاحب کے حالات و واقعات اور سیرت و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے، چوتھے باب میں بھوپال کی بنا سے نواب صدیق حسن خان کے دور تک کے نوابوں کا ذکر ہے، پانچویں باب میں بھوپال کی علمی، دینی اور ادبی حیثیت واضح کرنے کے لئے نواب صاحب کے دور تک کے ممتاز اہل علم اور اصحاب کمال کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا ہے، چھٹا باب نواب صاحب کی تصنیفات کے لئے خاص ہے، اور ساتویں باب میں ان کے دینی نقطۂ نظر اور علمی و سیاسی رجحانات و نظریات پر بحث کی گئی ہے، آٹھویں باب میں نواب صاحب کے علمی و دینی خدمات کے اثرات و نتائج پر گفتگو کرکے ان کی اہمیت دکھائی ہے، اس میں بھوپال کی موجودہ علمی سرگرمیوں کا حال بھی تحریر کیا ہے، آخری باب میں نواب صاحب کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ لینے والی اہم شخصیتوں شاہ ولی اللہؒ، مفتی صدر الدین آزردہ، سید احمد شہیدؒ امام شوکانیؒ، مدار المہام جمال الدین اور شاہجہاں بیگم کا تذکرہ ہے، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی کتاب کی زینت ہے، کچھ کمی کے باوجود یہ کتاب محنت و سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے، اور اس سے نواب صاحب کے حالات و کمالات کے علاوہ پچھلے دو سو برس کے علمی و سیاسی حالات و رجحانات اور گذشتہ اور موجودہ بھوپال کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، مگر نواب صاحب کی بعض اہم کتابوں الحطہ وغیرہ کا تعارف نہیں کرایا ہے، زبان و بیان کی بعض غلطیاں بھی اصلاح طلب ہیں جیسے مندرجہ ذیل جملے غلط یا ناہموار ہیں، "اس لئے دینداری کے معاملہ میں انھیں غیر معمولی صلاحیت حاصل تھی" (ص ۴۲) "اس طرح ابتدائی عمر ہی میں آپ کے اندر کافی استعداد تحصیل علوم کی پیدا ہوگئی" (ص ۴۳) "دونوں قرآن و حدیث پر براہ راست اجتہاد کو روا رکھتے ہیں" (ص ۲۹۹) "دونوں قرآن پاک کی تفسیر کے لئے

علمائے سلف کے احوال کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں" (ص ۲۹۹) "امام شوکانی کے زمانے میں یمن میں علم حدیث بہت فراوانی اور وسعت سے حاصل کیا جاتا تھا" (ص ۳۵۹) "جن کو اللہ نے اپنے پیغام کے ساتھ دنیا میں بھیجا ہے" (ص ۲۷۵) "وہیں جہاد جیسے اہم موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی ہے" (ص ۱۰۹) مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ زائد ہیں "والدہ نے انھیں یہ کہکر روک دیا کہ سب ساتھ مل کر چلیں گے" (ص ۱۰) "شاہ محمد اسحاق سے بھی استفادہ حاصل کیا" (ص ۳۴۵) تذکیر و تانیث کی غلطیاں "سلاطین مغلیہ کی دار السلطنت (ص ۵) اس دور کے طالب علمانہ زندگی، (ص ۸) اس کی تابعین (ص ۱۰۹) ترکیب کی غلطیاں "حالت یتیمانہ" (ص ۷۳) امر و نواہی (ص ۳۵۵) املائی غلطیاں۔ معمور (ص ۳۵) بجائے مامور، فرُق (ص ۲۰) بجائے فَرق، تبنیق (ص ۲۸۲) بجائے تطبیق، فخرجین (ص ۲۸۴) بجائے مخرجین، اہل تشنیعہ (ص ۲۹۹) بجائے اہل تشیع، کتاب کی قیمت بھی زیادہ ہے۔

تنقیدی معروضات:۔ مرتبہ، جناب ظفر احمد صدیقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۳۔ مجلد مع گردپوش قیمت بارہ روپیہ، پتہ فلاحی بکڈپو، پیلی کوٹھی، وارانسی۔

یہ کتاب جناب ظفر احمد صدیقی کے سات مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں پہلا اور تیسرا مضمون اہم ہے، (۱) قصیدہ، اصل ہیئت اور حدود (۳) شعر العجم اور تنقید شعر العجم، دو مزید مضامین بھی مولانا شبلی کے متعلق ہیں، جن میں ان کے فارسی تغزل اور تنقید نگاری پر گفتگو کی گئی ہے، پہلے مضمون میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے، کہ قصیدہ اردو اور فارسی کی طرح عربی کی بھی ایک مستقل صنف سخن کا نام ہے، اور بتایا ہے کہ عربی میں اصناف کا تصور اردو و فارسی سے مختلف ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے عربی کے اصناف سخن پر طویل بحث کرکے

دکھایا ہے کہ عربی شعر و ادب کے ماہرین نے بحیثیت صنف سخن قصیدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ عربی میں تمام مسلمہ اصناف سخن کو قصیدہ کہا جاتا ہے، مگر یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی تو یہ رجز و قطعات دونوں کے مقابل استعمال ہوتا ہے، اور کبھی محض قطعات کے، ممکن ہے عہد جاہلیت کی عربی شاعری کی حد تک مقالہ نگار کا خیال درست ہو مگر متاخرین میں متنبی تو قصیدہ نگاری ہی کی حیثیت سے مشہور رہے، اور ابو العلا معری کے یہاں قصیدوں کا وجود نہیں۔ تیسرے مضمون میں شیرانی صاحب کے شعر العجم پر اعتراضات کو باوزن قرار دیکر لکھا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبد السلام ندویؒ سے ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑا، "تنقید شعر العجم ایک بیش بہا تحفہ اور گرانقدر عطیہ ہے جسے تشکر و امتنان کے ساتھ قبول کرنا علمی و ادبی فریضہ ہے، نیز جس طرح سیرت النبی کی تکمیل سید سلیمان ندویؒ کے لئے باعث افتخار ہے، اسی طرح شعر العجم کی تنقید بھی حافظ شیرانی کے لیے طرۂ امتیاز قرار دی جا سکتی ہے، اور جب اول الذکر کی گرفت نہیں کی جاتی تو ثانی الذکر بھی مورد الزام نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔" اس بنا ر فاسد علی الفاسد اور قیاس مع الفارق کے بعد ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ نوجوان مصنف کے خیال میں "شبلی کی بہ نسبت حافظ محمود شیرانی کا علم زیادہ وسیع، نظر زیادہ باریک بیں اور قلم زیادہ حقیقت نگار واقع ہوا ہے"، رہے شبلی تو "وہ اصلاً نہ مورخ تھے نہ سوانح نگار نہ سیرت نویس تھے، نہ محقق و ناقد ...... وہ اصلاً علم کلام کے آدمی تھے"! اگر یہ بھی نہ مانا جائے تو کیا گر بڑھ جائے گا، وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی محققین اور ادیبوں کا موضوع بنے ہوئے ہیں، مصنف نے خود اپنا مقالہ اور دوسروں کے لئے بھی انہی پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں اور ایک ہونہار اہل قلم اور علم و تحقیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، انھیں علامہ شبلیؒ و سلیمانؒ پر گھسے پٹے اعتراضات

دہرانے کے بجائے تلاش و تحقیق کے دوسرے میدان کا رخ کرنا چاہئے ورنہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔

زرد پتوں کی بہار (سفرنامہ پاکستان) } مرتبہ۔ جناب رام لعل صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ اتر پردیش اردو اکادمی۔ ۲۱۔ آر۔ کے ٹنڈن روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ۔

اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل کا آبائی وطن میانوالی (مغربی پنجاب) تھا، ملک کی تقسیم کے بعد انھیں ہندوستان آنا پڑا اور اب برسوں سے انھوں نے لکھنؤ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی ہے، تینتیس برس بعد انھیں سنہ ۸۰ء میں پھر پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تو وہ لاہور، ملتان اور کراچی کے علاوہ میانوالی بھی گئے، یہ کتاب اسی یادگار سفر کی دین اور سوغات ہے، پاکستان میں جس محبت، گرم جوشی اور خلوص سے ان کا خیر مقدم ہوا اس کے تاثرات اور دوسرے احساسات کا اظہار ایسی واقعیت، خلوص اور صداقت سے کیا گیا ہے، جو قارئین پر اپنا گہرا نقش بھی چھوڑ جاتے ہیں، اور انھیں لطف و انبساط کی طرح درد و حسرت کی کیفیت سے بھی دوچار کر دیتے ہیں، انھوں نے اپنے قدیم وطن میں مہمان بن کر جانے اور اپنے گھر میں اجازت لیکر داخل ہونے کا جس پُر اثر انداز سے ذکر کیا ہے اس سے دل پر رقت طاری ہو جاتی ہے، سفرنامہ میں جن جگہوں کا ذکر آگیا ہے، ان کے بارہ میں معلومات بھی تحریر کئے ہیں، جو براہ راست واقفیت کا نتیجہ ہیں، رام لعل صاحب اردو کے اچھے اہل قلم اور بلند پایہ افسانہ نگار ہیں، اس لئے پاکستان میں ان کے شب و روز وہاں کی نئی اور پرانی نسل کے ارباب قلم شاعروں ادیبوں اور افسانہ نگاروں کے درمیان گذرے اس سفرنامہ میں ان سب کا ذکر بھی ہے۔

اور ان کی قلمی و ادبی کاوشوں کی نشاندہی اور ان کے بارہ میں اظہار خیال بھی جس سے ہندوستان والوں کو پاکستان کے افسانوی ادب کی رفتار کا خاص طور پر اندازہ ہوتا ہے، پھر جا بجا انھوں نے ادبی جلسوں اور احباب کی مجلسوں میں ادب اور ادبی مسائل کے بارہ میں دلچسپ تبصرے بھی کئے ہیں ان سے ان کے اچھے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے، انھیں زبان و بیان پر پوری قدرت ہے، اس لئے انھوں نے اپنے محسوسات و مشاہدات کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اس کی وجہ سے پڑھنے والے کو اس میں ناول و افسانہ جیسا مزہ ملتا ہے، گذشتہ چند برسوں میں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اردو کی متعدد مفید، معیاری اور بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں جس کے لئے وہ مستحق تبریک ہے، مگر افسوس کہ اکثر کتابیں غیر ذمہ داری اور بے پروائی سے شائع کی گئی ہیں اس کتاب میں بھی ڈاکٹر محمود الٰہی سابق چیرمین کے دیباچے کے شروع کے صفحے غائب اور فہرست کا صفحہ مکرر ہو گیا ہے اور ص ۱۰۹ کے بعد کا مضمون بھی شامل نہیں ہے، ص ۹۹ پر ۱۹۵۹ء غلط ہے، صحیح ۱۹۴۹ء ہے ایک جگہ دنیا کے بیشتر قومیں" لکھا ہے۔ (ص ۱۹۹)

الابیات المقدسہ :- مترجمہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن صاحب تقطیع متوسط کاغذ بہتر کتابت سائیکلو اسٹائل صفحات ۱۰۰ قیمت پندرہ روپے، دار حافظ، ۱۳ احاطہ میلاپورن، مدراس ۱۴۔

زیر نظر کتاب تقریباً دو صدی قبل مسیح کے تامل ناڈو کے ایک عظیم عبقری ترو ولوور کی شعری تصنیف ترو کرل کا عربی ترجمہ ہے جو تامل زبان میں تھی اور اس کے مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں میں ترجمے کئے جا چکے ہیں، یہ شعری مجموعہ مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے، دین و تدین، دولت و حکومت، وصل و محبت اور دوستی، ہر حصہ میں کئی کئی ابواب ہیں اور ہر باب میں متعدد

فصلیں ہیں، ہر فصل دس دس اشعار پر مشتمل ہے، اس طرح پوری کتاب ۱۳۳ فصلوں اور ۱۳۳۰ اشعار کا مجموعہ ہے، پہلے دونوں حصے پند و موعظت کا گنجینہ ہیں، اور ان میں بڑے حکیمانہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، حصہ اول میں زہد و حسن عمل کی تلقین کی ہے اور سوء عمل و رذائل سے بچنے کی ترغیب دلائی ہے، اور حصہ دوم میں سلطنت و ارکان حکومت کے بارہ میں دانشمندی کی باتیں درج ہیں، آخری حصہ میں جذبات الفت و محبت کی ترجمانی کی گئی ہے، مصنف چونکہ قدیم العہد ہیں، اس لئے ان کے حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا تاہم ان کے متعلق تامل ناڈو میں جو دلچسپ باتیں اور روایتیں مشہور ہیں لائق مترجم نے مقدمہ میں انھیں قلمبند کیا ہے، اور آزادی کے بعد خصوصاً تامل ناڈو کی علاقائی پارٹی ڈی۔ ایم۔ کے کے دور حکومت میں تامل زبان کی ترقی اور اس عظیم شاعر کے خدمات اور کارناموں کو نمایاں کرنے کے لئے جو اقدامات ہوئے ہیں انھیں بھی تحریر کیا ہے، کتاب کے آخر میں اپنی علمی، تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیوں کا حال بیان کیا ہے۔

(۱) فرمودات ختم الرسل
(۲) شبلی بلاد اسلامیہ میں
مرتبہ، جناب محمد واصل عثمانی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، کتابت قدرے بہتر، صفحات ۴۲ و ۶۴، شائع کردہ ایجوکیشنل پریس، کراچی۔

پہلی کتاب پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے حدیث کی خدمت کے جذبہ سے شائع کی گئی ہے، یہ چالیس منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، لائق مرتب نے ان کا معنی خیز اردو ترجمہ کیا ہے، اور بعض تشریح طلب حدیثوں کی مختصر مگر نہایت دلنشین تشریح کی ہے، دیباچہ بھی بہت اثر انگیز ہے، اس میں مسلمانوں کو دامن مصطفیٰ میں پناہ لینے اور اتباع سنت کی موثر انداز میں تلقین کی گئی ہے اور حدیث کی اہمیت، اس کی تدوین کی مختصر تاریخ اور ائمہ کے حالات بھی دئے ہیں، غالباً کتابت

وطباعت کی غلطی سے بعض فقروں کے ترجمے چھوٹ گئے ہیں، روضے اور صحاح ستہ کا املا غلطی
روزے اور صحہ ستہ لکھا ہے، دوسری کتاب میں بلاد اسلامیہ میں مولانا شبلیؒ کی سیر و سیاحت
کا ذکر ہے، اس میں دراصل ان کے سفرنامۂ مصر و شام کی خوبیاں اور خصوصیات دکھائی ہیں
اور دوسرے سفرناموں سے اس کا فرق بھی واضح کیا ہے، پھر مولانا کے سفر کا مقصد، ان کی
انفرادیت، نظریہ تاریخ، طریقہ تعلیم، کتبخانوں، علم و علما سے دلچسپی، حق گوئی، اور مسلمانوں اور
عربوں کے بارہ میں مستشرقین کے تحقیر آمیز رویہ پر مولانا کے درد و اضطراب کا ذکر کیا ہے اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا شبلی کی شخصیت کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے، اور ان کے
بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں توازن ہے، مولانا نے جن ملکوں کا سفر کیا تھا، سفرنامہ میں ان کے
سیاسی حالات نہ لکھنے کی جو وجہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھی ہے اس پر شیخ عطاء اللہ نے سرسید کی
محبت میں غلو کی بنا پر کچھ ناروا اعتراضات کئے ہیں، لائق مرتب نے ان کا اچھا جواب دیا ہے آخر میں
انھوں نے سفرنامہ کی جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان کا جواب خود سفرنامہ کے دیباچہ میں موجود
ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر سفرنامہ کا کوئی پاکستانی اڈیشن ہے، جو زیادہ غلط چھپا ہے
انھوں نے جن ادبی غلطیوں کا ذکر کیا ہے، ان میں بعض تو سرے سے غلطی نہیں ہیں، اور بعض طباعت
کی غلطی ہیں، جیسے "سلطان سے میرے لیے تمغہ مجیدی ادا ہونے کی درخواست کی" مصنف کو
ادا کے لفظ پر بیجا اعتراض ہے، مگر ہمارے پیش نظر نسخہ میں عطا ہے، جس کے بعد اعتراض کی گنجائش
نہیں رہ جاتی۔

ارمغان رخصتی: - از مولوی عبد المعبود نادان بستوی، تقطیع خورد، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۳۲ - قیمت دو روپیے۔ پتہ - سہیل بکڈپو سمریانواں بازار ضلع بستی یوپی۔

یہ شادی میں بچیوں کی رخصتی کے موقع پر کہی گئی نظموں کا مجموعہ ہے، ان میں انھیں شوہر کی خدمت و اطاعت عفت و حیا اور اسلامی طریقہ زندگی اختیار کرنے کی تاکید اور غلط رسم و رواج اور غیر اسلامی وضع قطع ترک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

"ض"

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ
ان کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں،
خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان
کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس
ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے
ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن
اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم
کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے
نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن
صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی
کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے
دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے
عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً
آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں
کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز
میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت: - ۲۲ روپیہ

مُرتبہ

سیّد صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"